لیڈر کی کرسی

کرشن چندر

مرتب
سردار احمد قریشی

ب اکادمی - کراچی

لیڈر کی کُرسی

(کرشن چندر کی مُنتخب کہانیاں)

مُرتّب

سردار محمّد قریشی

سابق مدیر روزنامہ ہلالِ پاکستان کراچی

پبلشرز

ادب اکادمی کراچی

قیمت: ۱۰ر روپے مطبوعہ: احباب پرنٹرز کراچی تاریخ اشاعت: نومبر ۸۵ء

اپنی بات

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے، ادب اکادمی کی پہلی پیشکش ہے۔ ادب اکادمی گھٹیا اور بازاری لٹریچر کے خلاف جہاد کا نام ہے اس کا مقصد معیاری اور بہترین ادب کی اشاعت ہے جو بلاشبہ ایک قومی خدمت ہے۔

بیسویں صدی میں سامراجی طاقتوں نے اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ترقی پذیر قوموں کے خلاف سازشوں کے جو نئے جال بچھائے ہیں ان میں ہتھیاروں، منشیات اور گھٹیا بازاری لٹریچر کا پھیلاؤ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اپنے آس پاس نظر اٹھا کر دیکھئے کہ ہم کس بری طرح اس جال میں پھنستے چلے جا رہے ہیں اگر ہم ایک آزاد اور مختار قوم کی طرح زندہ رہنا اور ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سنجیدگی کے ساتھ اپنے معاشرتی مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ جس طرح "ریل آتی ہے ۔ ریل جاتی ہے" کا شمار قافیہ اور ردیف کے اعتبار سے صحیح اور ہم وزن ہونے کے باوجود اچھے شعر میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح مہم جوئی، جاسوسی، حسن و عشق اور جرم و سزا کی فرضی کہانیاں بھی جو اکثر ہمارے نوجوانوں کے زیر مطالعہ رہتی ہیں، بہترین ادب کے زمرے میں نہیں آتیں۔ بہترین ادب تو وہ ہے جو ہمارے معاشرے کے مسائل کی بے لاگ نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا حل بھی پیش کرے۔ اپنے پڑھنے والوں کو بہترین ادبی تفریح مہیا کرنے کے ساتھ اپنے مسائل کو سمجھنے کا شعور بخشے اور راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کرے

جدید دور کے عظیم ادیبوں نے جو بہترین ادب تخلیق کیا ہے، اس میں کہانی

کو سب سے موثر تکنیک کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کی کاٹ برداشت سے بھی باہر محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس میں مبالغہ ذرہ برابر بھی نہیں ہوتا۔ اس میں سچ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ اور مثل مشہور ہے کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ کرشن چندر ہمارے ان عظیم ادیبوں کے سالارِ قافلہ ہیں۔ جنہوں نے ساری عمر اپنے قلم سے معاشرے کی برائیوں کے خلاف جہاد کیا۔ لیڈر کی کرسی انہی کرشن چندر کی پندرہ زہریلی اور امر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں کی مقبولیت کا اندازہ اس ایک بات سے کیجئے کہ پڑوسی ملک بھارت میں بڑے بڑے موقر ادبی جرائد انہیں نئے ناموں سے دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ گویا یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستان نے کرشن چندر کے بعد پھر ان کے پائے کا ادیب پیدا نہیں کیا۔ اور اس حقیقت کے پیش نظر اس بات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ کرشن چندر ہندوستان کے شہری ضرور تھے لیکن وہ اردو کے ادیب تھے اور اردو ہندوستان کی قومی زبان نہیں ہے۔ اس لحاظ سے کرشن جی پر ہمارا حق زیادہ بنتا ہے۔

ادب اکادمی آئندہ بھی اپنے مقصد کے حصول کے لئے برصغیر پاک و ہند کے نامور ادیبوں کے فن پاروں پر مشتمل بہترین ادبی کتب پیش کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اپنے ہاں کے نئے اور اچھے لکھنے والوں کو متعارف کرانے کا ایک قابل عمل پروگرام بھی اس کے زیر غور ہے۔ یہ کوئی پیسہ کمانے کا تجارتی ادارہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیش نظر "نہ نفع نہ نقصان" کی بنیاد پر خالص مشنری جذبہ کے تحت بہترین ادب کی اشاعت ہے اور ظاہر ہے یہ کام آپ سب کی سرپرستی کے بغیر ناممکن ہے۔ اکادمی اپنے ادب نواز

ایجنٹ حضرات کی خاص طور پر ممنون احسان ہے جن کے تعاون سے یہ کتاب آپ تک پہنچی۔ اب یہ کام آپ کا ہے کہ ان سے مسلسل رابطہ رکھئے اور اکادمی کی دوسری آنے والی کتابوں کے لئے اپنے آرڈر نوٹ کروا دیجئے۔ آپ کی سہولت کے لئے اکادمی کے ان معزز ایجنٹ حضرات کی مکمل فہرست اگلی کتاب میں شائع کی جائے گی۔

ازراہ کرم اس کتاب کے بارے میں اپنی قیمتی رائے سے ضرور مطلع فرمائیے۔

اس کتاب میں

۱- گردش ——— ۷
۲- نیوٹرل زون ——— ۱۷
۳- دنیا آمچی آہے ——— ۳۳
۴- بدنظر ——— ۴۱
۵- چور کا بھائی ——— ۵۱
۶- شرمیلی روح ——— ۶۳
۷- پالکی ——— ۷۳
۸- اوورٹیک ——— ۸۳
۹- ایک خوشبو اڑی اڑی سی ——— ۹۳
۱۰- ترازو ——— ۱۱۷
۱۱- خوشی ——— ۱۲۹
۱۲- بس اسٹاپ ——— ۱۴۱
۱۳- جولی ——— ۱۵۱
۱۴- بیوی کترا ——— ۱۶۳
۱۵- لیڈر کی کرسی ——— ۱۷۷

ہوٹل چاندنی کراچی

روشنیوں کے شہر کراچی میں باہر سے آنے والے

معزز مہمانوں کے لئے

قیام اور طعام کا بہترین مرکز

روشن اور ہوادار کمرے، پاکیزہ صاف ستھرا ماحول، اور عمدہ و لذیز انگلش اور پاکستانی کھانے ہوٹل چاندنی کی ایسی خصوصیات ہیں جن کا مقابلہ شہر کے فائیو اور فور اسٹار ہوٹلز بھی نہیں کر سکتے۔

ایک بار ضرور تشریف لائیے

اور

میزبانی کا شرف بخشیے

ہوٹل چاندنی

داؤد پوتہ روڈ۔ صدر۔ کراچی فون: ۵۱۱۴۸۷

گردش

جگ موہن پچیس سال بعد پہل گام واپس آیا تھا۔ ان پچیس سالوں میں دُنیا کتنی بدل گئی تھی۔ وہ خود کتنا بدل گیا تھا۔ پہلے وہ دن میں صرف ایک مرتبہ شیو بناتا تھا۔ اب اسے دوبار شیو کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اپنے کپڑوں کے بارے میں وہ پہلے کتنا بے پرواہ تھا۔ اُسے یاد ہے، پہلی بار جب وہ پہل گام آیا تھا۔ آج سے پچیس سال پہلے تو وہ صرف ایک قمیص اور پتلون میں گھوما کرتا تھا۔ اس کی چوڑی پیشانی اور فراخ سینہ دیکھ کر عورتیں کیسے شرم سے گردن جھکا لیا کرتی تھیں۔ اب وہ سینہ اندر دھنس چکا تھا، وہ گال پچک کر رہ گئے تھے۔ اس کی پیشانی پر کتنی ہی گہری سلوٹیں نمودار ہو چکی تھیں۔ اسے اب اپنے چھدرے چھدرے بالوں کی سفیدی چھپانے کے لئے خضاب کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اب وہ صرف قمیص اور پتلون میں نہیں گھوم سکتا تھا۔ کوٹ، پتلون، واسکٹ اور ٹائی لگا کے گھومتا تھا تاکہ کوئی اس کے مستعد اور متعدی مرض کے شکار جسم کی بدنمائی سے آگاہ نہ ہو سکے۔ پچیس سال پہلے اس کے جسم سے صحت، جوانی اور تن درستی کی مہک آتی تھی اب اسے خوشبوؤں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ وہ خود کتنا بوڑھا ہو گیا تھا لیکن پہل گام کتنا جوان تھا اُتنا ہی حسین اور خوب رُو، جتنا آج سے پچیس سال پہلے اس نے دیکھا تھا

اسی پہل گام کی خوب صورت وادی تھی۔ وہی اس کا سیماب صفت لدّر کا دریا تھا۔ اس کا چمکتا ہوا شفاف پانی جگہ جگہ سے کیسا نیلا تھا جیسے کسی نے اس میں آسمان گھول دیا تھا۔ جگہ جگہ سے کیسا کیسا سبز ہو جاتا تھا، جیسے چیڑ کے جھومروں نے اپنا سارا رس اس میں اتار دیا ہو۔ جگہ جگہ کیسے کیسے

اس کی لہریں کسی چھوٹے، پیارے، البیلے سے، سبز کائی میں ملبوس پتھر کے گرد گھومتی تھیں جیسے گوپیاں کتھک ناچ میں کرشن کے گرد ناچتی ہیں۔ مشرقی پہاڑوں پر دیودار اور پیاڑ کے اونچے اونچے درخت اپنی آنکھوں میں صدیوں کا وقار لئے سورج کی طرف تک رہے تھے اور ان کی پھیلی ہوئی سبز باہنوں نے جنگل میں چاروں طرف سے روشنی اپنی آغوش میں لے لی تھی۔ سورج کی کرنیں دُور اُوپر سے آئی تھیں اور اب پہاڑ دیودار اور چیڑ کے درختوں کے چھتناروں میں گھر کی عورتوں کی طرح کام کر رہی تھیں۔ برتپا کرن کا گھر تھا۔ روشنی نے سایہ بنایا تھا۔ جنگل میں چاروں طرف خاموشی تھی اور چاروں طرف سایہ تھا۔ صرف کہیں کہیں گھنے جنگلوں میں جہاں آسمان نظر آتا، وہاں سورج کی لاکھوں کرنیں درختوں سے بچ کر یوں زمین کی طرف بھاگتیں جیسے روشنی کا آبشار گر رہا ہو۔ آہ، یہ پہل گام! کتنا خوبصورت ہے سبز، سنہری غنودگی میں لپٹا ہوا، خواب آگیں، ہر لمحے بنفشہ کے پھولوں کی طرح ہنستا ہوا ہر سانس محبوب کے لمس کی طرح مہکتا ہوا۔ یہ میرا وہی پُرانا پچیس برس پہلے والا حسین اور دل کش پہل گام ہے۔ ان پچیس سالوں میں دُنیا کتنی بدل گئی ہے۔ وہ خود کتنا بدل گیا ہے۔ لیکن یہ پہل گام نہیں بدلا۔ وہی اس کا حُسن ہے، وہی اس کی دل ربائی ہے وہی اس کی دل کشی اور دل آویزی اور کچھ ادائی ہے۔ جگ موہن نے سوچا یہ کتنا اچھا ہے کہ انسان بدل جاتا ہے لیکن پہل گام نہیں بدلتا۔ اپنی خوبصورتی سمیٹے اُسی طرح قائم و دائم رہتا ہے۔

جگ موہن نے اپنے ذہن کے افق سے پچھلے پچیس سال کی یادوں پر اک نگاہ ڈالی اور اس کی نظر کے سامنے پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم کی قبریں اور صلیبیں اُبھرتی چلی آئیں۔ ان قبروں کے پس منظر میں اس کے کارخانوں کی چمنیاں دُھواں اُگل رہی تھیں۔ پہلے کپڑے کی ایک مِل تھی۔ پہلی جنگِ عظیم میں دو ہوئیں۔ دُوسری جنگِ عظیم میں چار ہوئیں۔ کتنی قبروں کے بعد کارخانے کی ایک چمنی بنتی

ہے۔ اُسے اپنا یورپ کا سفر یاد آیا، پیرس کے فحبہ خانے، روم کی گلیوں میں گھومتی ہوئی وہ لاطینی حسینائیں، برلن کے اُس ریستوران میں ہر میز پر ایک ٹیلی فون کا کنکشن۔ ایک ٹیلی فون کیجئے، ایک لڑکی بلا لیجئے۔ جگ موہن نے ساری دُنیا دیکھی تھی شنگھائی کے کابرے، رایوی جیز اور بونس آئرز کے بونے، وادیوں میں ناریل کی طرح لانبی اور لہکتی ہوئی اسپینی گیتوں کی طرح ہیجان افروز عورتیں، عمدہ شراب، خوب صورت رقص اور ناریل کے پیڑ پر چاند کسی موری حسینہ کے بالوں میں نیٹلا کی طرح لٹکا ہوا۔ ہائے یہ دُنیا کتنی حسین تھی۔ ان پچیس سالوں میں جگ موہن نے جی بھر کے عیش کیے تھے۔ دِل کھول کر اپنا جسم اور روپیہ خرچ کیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کا روپیہ گھسا نہیں تھا۔ لیکن اس کا جسم گھس گیا تھا۔ اُس نے بڑھتی ہوئی مزدوری اور بڑھتے ہوئے انکم ٹیکس کے باوجود ہزار بے ایمانیوں سے اپنا بینک بیلنس برقرار رکھا تھا۔ کبھی کٹوتی سے، کبھی حساب کی ہیرا پھیری سے متعدد بے ایمانیوں سے اُس نے اپنا روپیہ گھسنے نہیں دیا تھا لیکن اب اس کا جسم گھس چکا تھا۔ اب وہ اسے بھی انجکشنوں سے، ٹانک کی گولیوں سے اور ہزار طرح کی مصنوعی کوششوں سے برقرار رکھنے کی کوشش کرتا تھا یہ کوششیں بھی اُس کے جسم سے ایک طرح کی بے ایمانی سے کم نہ تھیں۔ اُسے اس کا احساس تھا کہ ہر ہیجان آفریں دوا، اُس کی طاقت بالآخر کم کرتی ہے۔ جیسے، دوروں سے ہر طرح کی بے ایمانی بالآخر اُس کی طاقت کم کرتی ہے لیکن جب تک وہ جیتا ہے ن اپنے روپے سے اور اس جسم سے جی بھر کے لذّت حاصل نہ کرے؟ مرنے بعد جنّت تو صرف غریبوں کو ملتی ہے۔

جگ موہن اُٹھ کھڑا ہوا۔ جس کہنہ دیودار کے تنے سے وہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کیوں کہ اُسے نیچے ڈھلوان کی سڑک پر چلتی ہوئی پھلوں کی ا اُٹھائے ایک کشمیری حسینہ نظر آ رہی تھی۔ اُس نے دُنیا میں ہر طرح کی خوب صورت

عورت دیکھی تھی۔ لاطینی کوارٹرز میں گویا سپید کوارٹز کے ترشے ہوئے شفاف، برفاب سے جسم، استنبول کے قہوہ خانوں میں ناچتی ہوئی ترکی حوریں۔ ہر نگاہ سے شمپین چھلکاتی ہوئی، صندلیں پھولوں میں ملبوس نیم عریاں ہوائی، دوشیزائیں، اپنے رنگ و خون میں دوبرِ اعظموں کی خوبصورتی سمیٹے سیپ کے موتی کی طرح حسین، طرح طرح کی خوب صورتی اُس نے دیکھی تھی۔ لیکن کشمیری حُسن کا جواب نہیں۔ ایسا حُسن جو کنول کی طرح صبیح اور گلاب کی طرح سُرخ ہو۔ جو چاندنی کی طرح شرمائے اور سُورج کی کرنوں کی طرح مسکرائے کشمیر کی آنکھیں جو کبھی تو جھیل کی طرح خاموش، پُرسکون و پُراسرار معلوم ہوں اور کبھی جھرنے کی طرح کھِل کھِلا کر سارا راز کہہ دیں۔ کشمیر کا مینہہ کبھی تو برف کی طرح ٹھنڈا اور خاموش جیسے معصیت اُسے چھُو تک نہیں گئی اور کبھی یوں دہکتا ہوا شعلہ جیسے جنگل میں آگ لگ گئی ہو۔ اتنے نشیب و فراز سمیٹنے والا حُسن اُس نے کشمیر کے سوا کہیں نہ دیکھا تھا۔ اسی لئے تو پہل گام کی کشش اتنے سالوں بعد اُسے پھر کھینچ لائی تھی۔

پھلوں کی ٹوکری اٹھائے ہوئے ڈھلواں سڑک سے گذرتی ہوئی کشمیری حسینہ کو دیکھ کر اُسے آج سے پچیس سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا۔

ایک دن وہ پہل گام سے چند دن واڑی جانے والی سڑک پر ٹہل رہا تھا ٹہلتے ٹہلتے دور تک نکل گیا۔ سہ پہر کی دھوپ خوش گوار تھی اور جب کبھی چلتے چلتے دھوپ کی تمازت سے اُس کے گال تمتما اٹھتے تو ہوا کے برفیلے جھونکے اس کے گالوں سے مس ہو کے گرمی یوں اُڑا لے جاتے جیسے مصور کا برش تصویر سے زائد رنگ غائب کر دیتا ہے وہ آہستہ آہستہ ایک گیت گنگنانے لگا۔ یکایک یہاں اُسے ایک لڑکی نظر آئی جو پھلوں کی ٹوکری سر پر رکھے پہل گام کی طرف جا رہی تھی۔ لڑکی اُس کے قریب آ کے مسکرائی، وہ بھی مسکرایا۔ لڑکی نے پھلوں کی ٹوکری جھکائی، وہ بھی جھکا۔ "خوبانیاں میٹھی ہیں"؟ اُس نے پوچھا "دیکھ لو" وہ اس لڑکی کی آنکھوں کی گہرائی میں کھو گیا۔ لڑکی نے ایک خوبانی

ٹوکری سے اٹھاکر اُسے دکھاتے ہوئے کہا "بالکل پکی ہوئی اور تیار ہیں ان کی رنگت دیکھو
سنہری بے داغ"۔ وہ اس لڑکی کے ہاتھوں کی گلابی، بے داغ جلد کی نرمی پر غور کرنے لگا۔
"بہت سستی ہیں، دو روپے کی ٹوکری ہے۔ ٹوکری لے لو"

اس نے اپنی جیب سے ریشمی رومال نکالا۔ اُسے زمین پر پھیلا دیا۔ اُس میں چُن
ن کر دو درجن کے قریب خوبانیاں رکھیں۔ لڑکی کو آٹھ آنے دیے۔ لڑکی نے حیرت اور
مسرت سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا "یہ آٹھ آنے بہت زیادہ ہیں اور لے لو"۔ اُس
نے خوبانیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"پھر لے لیں گے ۔۔۔ تم کہاں رہتی ہو؟"

لڑکی نے پیچھے کی طرف اشارہ کر کے کہا "سڑک کے اس موڑ کے پیچھے میرا گھر ہے
خوبانیاں ہمارے گھر کے پیڑوں کی ہیں۔ ہمارے ہاں خوبانیوں کے چار پیڑ ہیں"

"کبھی ہم تمہارے گھر آئیں گے۔ اپنے سامنے پیڑوں سے خوبانیاں اُتروا کے
کھائیں گے"

"آنا"، لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

لڑکی ٹوکری اُٹھانے کو تھی کہ جگ موہن نے ہاتھ بڑھا کر ٹوکری اُس کے سر پر رکھ دی
دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے مس ہوئے۔ اس ایک لمحے کے لمس میں صدیوں کی جوانی
اُٹھی۔ جب سے دنیا بنی تھی، جب سے شعلہ بھڑکا تھا۔ جب سے دل دھڑکا تھا۔ جب سے
ٹپکا تھا۔ کتنے ہی لاکھوں، کروڑوں برس کی تخلیق اس ایک لمحے میں آ کر تڑپ کے بے قرار
۔ جگ موہن کی سانس زور زور سے چلنے لگی۔ لیکن اُس نے بہت ضبط سے کام لیا اور
آگے چلا گیا۔ چندن واڑی کی طرف، پہل گام کی طرف۔ اگلے موڑ پر جا کر اُس نے لڑکی
دیکھ لیا۔ خوبانی کے چار پیڑوں والا گھر۔ گھر کے ایک طرف چھوٹا سا ٹیلا تھا جس پر نرگس
کے تختے کھلے ہوئے تھے، اب وہ یہ گھر کیسے بھول سکتا تھا۔

اس کے بعد اُسے وہ لڑکی کئی بار ملی۔ کئی بار اس نے خوبانیاں خریدیں لیکن ہر بار وہ اس سے بہت کم خوبانیاں لیتا اور پیسے زیادہ دیتا تھا۔ ایک بار اس نے پہلگام کے بازار میں ایک خوب صورت کشمیری رومال خریدا۔ اُس میں کشمش، اخروٹ، بادام رکھے اُن کے اُوپر دس کا نوٹ رکھا اور رومال اچھی طرح باندھ کر اُس نے ایک ہاتو کو اپنے سا یا اور اُسے سڑک کے موڑ پر خوبانی کے چار پیڑوں کا گھر دکھا کے کہا "وہ لڑکی کسی کام کو جب بھی گھر سے باہر نکلے، یہ رومال اس کے ہاتھ میں دے دینا پھر وہ جو کچھ تم سے کہے، مجھے آ بتا دینا۔"

اُس کے بعد جگ موہن اپنے خیمے میں لَوٹ آیا۔ اور ہاتو کا انتظار کرنے لگا۔ بہ دیر بعد ہاتو واپس آیا۔ وہ ریشمی رومال اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور اُسی طرح بھا تھا۔ جگ موہن کا دل دھک سے رہ گیا۔ ہاتو دُور سے اُسے جھلاتا ہوا آ رہا تھا۔ اور وہ گا رہا تھا۔ جس میں جب خزاں آتی ہے تو چنار کے پتے محبوب کے رخساروں کی شُعلہ رُو ہو جاتے ہیں۔ "کم بخت"! جگ موہن نے اپنے دِل میں جھنجھلا کر کہا۔ "اُس رُومال واپس کر دیا اور یہ سالا گا رہا ہے۔"

ہاتو نے خیمے کے اندر آ کے وہ بھرا ہوا ریشمی رومال جگ موہن کے سامنے ر جگ موہن کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس رُومال کی گرہیں کھولنے لگا۔ رُومال کے اندر روپے کا نوٹ تھا، نہ اخروٹ تھے نہ بادام ..... نرگس کے پھول ہی پھول تھے۔ ہاتو مسکرا کر کہا "صاحب بخشیش!"

خوبانی کے چار پیڑوں والے گھر میں وہ رات کتنی حسین تھی، کتنی پیاری، گداز اور مہربان تھی۔ اُس رات کے تصوّر ہی سے جگ موہن کے دِل کا کونا کونا اس وقت خمار آلود مسرّت سے لب ریز ہو گیا۔

وہ تیز تیز قدموں سے نیچے سڑک سے گزرتی ہوئی پھلوں کی ٹوکری اُٹھائے عورت
کی طرف چلا گیا۔ عورت نے اپنی پھلوں والی ٹوکری جھکائی۔ جگ موہن بھی جھکا۔ ٹوکری
میں بھری آلوچے تھے۔ "میٹھے ہیں،، ؟۔ جگ موہن نے پوچھا۔
"چکھ کے دیکھ لو۔"
"چکھ لوں؟" جگ موہن نے معنی خیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔
کشمیری عورت کے رخسار تازہ سیب سے زیادہ سُرخ ہو گئے۔ اور اُس کے کانوں
میں چاندی کی بالیاں جھک جھک گئیں۔ "ہاں" وہ کمزور آواز میں بولی۔ اُس کے ساتھ سات آٹھ
سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ وہ اُسے کہنے لگی "صاحب کو ایک آلوچہ دو۔"
"یہ تمہارا لڑکا ہے"؟
"ہاں" عورت کا ہاتھ بے اختیار لڑکے کے سر پر گیا۔
"اس کا نام کیا ہے؟"
"قادر" وہ بڑے فخر سے بولی۔
قادر جگ موہن کی طرف دیکھ کر بڑی بے خوفی سے مسکرایا۔ جگ موہن نے ایک آلوچہ
کھایا پھر اُس نے جیب سے ایک ریشمی رومال نکالا۔ اس میں تھوڑے سے آلوچے لے لئے ایک روپیہ
عورت کو دے دیا۔ آٹھ آنے بچے کو۔ "یہ کس لئے"؟
"بچہ ہے مٹھائی کھائے گا۔"
"ہاں" قادر نے کہا۔ "میں مٹھائی کھاؤں گا۔" اور اُس نے اٹھنی جیب میں ڈال لی۔
سنہرے بالوں کا ایک لچھا اُڑ کر عورت کے رخسار پر آ رہا۔ اُس نے اپنے بالوں کی لٹ
سلجھاتے ہوئے کہا۔ "ذرا یہ ٹوکری اُٹھوا دو صاحب"!
جگ موہن کے ہاتھ اُس عورت کے ہاتھ سے ملے اور اُسے آج سے پچیس برس پہلے کا خوبانی
کے اشجار بیڑوں والا گھر یاد آیا لیکن اس یاد کے باوجود اُس کی رگوں میں وہ گرمی، وہ گیت، وہ

ارتعاش پیدا نہیں ہوا جو آج سے پچیس سال پہلے اُس کی رگوں میں جھنجھنایا تھا۔ اُس ملس اور اس ملس کے بیچ میں سینکڑوں عورتوں کی اُنگلیاں کھڑی تھیں جو اپنے ہاتھوں میں پاؤنڈ ڈالر، لیرا، فرانک اور دینار لئے غلاموں کی منڈی میں اپنا سب کچھ بیچ رہی تھیں۔ بھاؤ تاؤ کر رہی تھیں۔ اور بھاؤ تاؤ سب کچھ ہونے کے بعد بھی بھاؤ تاؤ ہی رہتا ہے۔ گیت کبھی نہیں بن سکتا۔ جگ موہن نے تاجرانہ انداز میں عورت کو سر سے پاؤں تک دیکھا، جانچا، تولا، سوچا یہ کتنے میں بکے گی؟ پھر دھیرے دھیرے مسکرایا اور آلوچے کھاتا ہوا مارکیٹ پر چل دیا۔ وہ دھیرے دھیرے اُس عورت سے دُور لیکن اُسے نگاہ میں رکھے ہوئے چلتا رہا۔ کبھی کبھی وہ عورت بھی گھوم کر دیکھ لیتی کہ وہ اُس کا پیچھا کر رہا ہے لیکن کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

شام ہوتے ہوتے وہ عورت اپنے مصری آلوچوں کی ٹوکری بیچ کر گھر لوٹ گئی۔ لکڑی کے پُل کے اُس پار گھاٹی پر ایک دل کشا کنج میں گھرا ہوا لکڑی کے نا تراشیدہ کندوں کا بنا ہوا اُس کا چھوٹا سا گھر تھا جس پر پھولوں کی بیلیں زمین سے اُٹھ کر اُوپر چھت تک چلی گئی تھیں۔ جگ موہن تک اُن پھولوں کی طرف دیکھتا رہا، پھر لوٹ آیا۔ اس کے بعد کئی بار جگ موہن کو وہ عورت ملی۔ کئی بار اُس نے اس عورت سے مصری آلوچے خریدے۔ عورت کو آلوچوں کے دام دیئے۔ قادر کو اُس کے لئے پیسے دیئے۔ قادر جگ موہن سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ ایک دن جگ موہن نے بازار سے ایک خوبصورت رومال خریدا، اُس میں کشمش، بادام اور اخروٹ رکھے اُس کے اوپر دس نوٹ رکھ دیا اور رومال میں گرہ لگا کر اُسے قادر کے حوالے کر دیا اور اس سے کہا "اپنی ماں کو دے دو اور جو بات وہ کہے وہ مجھے میرے خیمے میں آکر بتا دینا۔"

قادر نے مسکرا کر کہا "بہت اچھا۔"

سورج لدّر کے اُس پار پہاڑوں میں غروب ہو رہا تھا جب قادر واپس اُس کے خیمے پہنچا۔ اتنے میں جگ موہن نے شیو بنائی، اپنے جسم میں خوشبو لگائی اور اپنی طرف سے بالکل تیار خوش خوش بیٹھا تھا۔ قادر رومال جھلاتا ہوا آ رہا تھا۔ رومال بھرا ہوا تھا۔ جگ موہن

نگاہوں میں پھول ہی پھول کھلتے گئے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کشمیر کی دُلہن اپنی سینکڑوں رنگین آنکھوں سے شرما کر اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ قادر نے خیمے کے اندر آکر بھرا ہوا رُومال جگ موہن کے سامنے رکھ دیا۔ جگ موہن نے کانپتے ہاتھوں سے رومال کھولا۔ رُومال میں کشمش نہ تھی، خروٹ اور بادام بھی نہیں تھے ایک پھٹا پُرانا گھسا ہوا جوتا تھا جس میں اُس کا دس روپے کا نوٹ لکھا ہوا تھا۔ جگ موہن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے وہ پھٹا ہوا جوتا کھینچ کر اُس کے مُنہ پر مارا دغصّے سے اُس کے گال تمتما گئے اُس نے قادر سے جھنجھلا کر پوچھا "یہ کیا ہے؟"

جواب میں قادر مسکرایا، پھر ذرا ہنسا۔ پھر زور سے ہنسا، پھر بھاگتا ہوا اور ہنستا ہوا علوان کے نیچے دوڑتا چلا گیا۔ دُور سے جگ موہن کے کانوں میں اُس کی ہنسی کی آواز آتی رہی۔

کم کھائیں مگر اچھا کھائیں

نیو ایشیا بیکری

ہماری نئی مختلف النوع اقسام

ہر قسم کی تقریبات کے لئے کریم۔ پائین ایپل۔ فروٹ اور پلین کیکس کی بہت سی اقسام، پیسٹریز، چکن اور مٹن پیٹیز کے کئی ذائقے اور ہر قسم کے بسکٹ۔

۱۷۱۔ نزد خوجہ جماعت خانہ

گارڈن ایسٹ۔ برنس روڈ۔ کراچی

فون : ۷۱۱۸۹۵

نیوٹرل زون

جرا اور جری پونچھ کے پہاڑی علاقے میں چھانجل گاؤں میں رہتے تھے۔ چھانجل گاؤں علیا آباد روڑی کو جانے ہوئے رستے میں پڑتا ہے یہاں ایک کوہستانی سلسلہ ختم ہوتا ہے اور دوسرا کوہستانی سلسلہ شروع ہوتا ہے اور ان دونوں سلسلوں کے درمیان ایک تنگ گہری سی گھاٹی میں ایک پہاڑی نالہ بہت زور شور سے بہتا ہوا پتھروں اور چٹانوں سے سر پٹکتا ہوا پونچھ کے میدانوں کی طرف چلا جاتا ہے، یہاں گہری گھاٹی پاٹ کر ایک لکڑی کا پل بنایا گیا ہے اور چھانجل گاؤں اس پل کے دونوں طرف اونچے نیچے ٹیکروں پر نالے کے دونوں طرف آباد ہوتا چلا گیا ہے، جدھر جدھر نالہ چلتا ہے، اُدھر اُدھر دھان کے کھیت جاتے ہیں۔ اور گاؤں کے گھر، مردوں کے ہل، عورتوں کی محبت اور بچوں کی ہنسی جاتی ہے اور زمین، پانی اور محبت کا ایک عجیب سا مثلث بنتا چلا جاتا ہے اور اس مثلث میں کوئی کمی نہیں ہے۔ کتنی معمولی سی بات ہے۔

جرا اور جری کی زندگیاں بھی اسی معمولی سے ڈھرّے پر گزر رہی تھیں، جرا کا گھراٹ (پن چکی) نالے کے اس پار تھا۔ جہاں وہ اُسی گھراٹ سے ملے ہوئے ایک چھوٹے سے گھر میں اپنی بوڑھی ماں اور باپ کے ساتھ رہتا تھا اور جری ندی کے اس طرف بھیڑ بکریاں چرایا کرتی تھی۔ دونوں کے بیچ میں لکڑی کا پل تھا جو چھانجل گاؤں کے دونوں حصّے ملاتا تھا اور پونچھ سے علیا آباد اور روڑی آتے جاتے مسافروں اور قافلوں کی آمد و رفت کے لیے بڑی آسانی بہم پہنچاتا تھا۔ سرِ شام کئی قافلے یہاں آکر پل کے دونوں طرف قیام کرنے کے لیے رکتے، پن چکی والے جرے سے آٹا پسوایا جاتا۔ جری کے بکروال باپ سے گائے بھینسوں کا دودھ طلب کیا جاتا۔ جری

دودھ بھری مٹکی سر پر اٹھائے پل کے اس پار سے اُس پار جاتی اور دن میں کئی بار جرے کے سامنے سے گزر جاتی جو اسی کی طرح سر پر بجرے کی کھال میں آٹا رکھے تا نلے والوں کو آٹا پہنچانے جاتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ لیکن جانا نہ تھا، دیکھنے اور جاننے میں بہت فرق ہے اور پھر جرا اور جری بہت ہی معمولی قسم کے لوگ تھے جری سانولے رنگ کی ایک لڑکی تھی جس کی آنکھوں میں نگاہوں میں لبوں میں، چال ڈھال میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ دن بھر اپنے باپ کے گلے کی بھیڑ بکریاں، گائیں بھینسیں نالے کے کنارے کنارے چرایا کرتی اور دوپہر کو ندی کے تلے کے درمیان جو چنار کا درخت کھڑا تھا، اس کے سایے میں اپنے ڈھور ڈھنگر لا کھڑے کرتی اور خود آرام سے کسی بھیڑ کا بچہ یا بکری کا میمنا گود میں لے کر یا تو سو جاتی یا پہاڑی گیت گایا کرتی ایسے پہاڑی گیت جو اس کی طرح ہزاروں پہاڑی لڑکیاں شب و روز گاتی ہیں۔ ان پہاڑی گیتوں میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ پہاڑی گیت جری سے پہلے اس کے سامنے گائے گئے تھے اور اس کی ماں نے اپنی ماں سے سیکھے تھے اور اس کی ماں نے اپنی ماں کی ماں سے مطلب یہ کہ یہ گیت نئے نہیں تھے۔ اس میں جری نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں بڑھایا تھا یہ گیت پہاڑوں کی طرح پرانے اور دھان کے کھیتوں کی طرح جانے پہچانے جاتے تھے اور جری نے ہزاروں لڑکیوں کے لبوں سے سنے تھے ان کے اچھے معلوم ہونے کے باوجود ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی خود جرا کہاں کا یوسف تھا، اس کے خدوخال موٹے اور بھدے تھے۔ رنگ کالا تھا اور بلا وجہ ہنسنے کی اس میں بہت بری عادت تھی اس کے ہاتھ موٹے چوڑے اور چکلے تھے اور وہ اکثر اپنی ٹانگیں جن پر بہت سخت اور کھردرے بال تھے۔ بطخ کی طرح پھیلا کر چلتا تھا، اور اپنے سر پر آٹے کی ڈیڑھ من کی کھال بہت آسانی سے رکھ کر پل کے اس پار سے اس پار جا سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہزاروں پہاڑی مرد شب و روز اس سے بھی زیادہ بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اس لیے جری نے اس میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جو اسے اپنی طرف کھینچ سکتی۔ ہاں ایک صبح اس نے کچھ بہت عجیب وغریب سا محسوس کیا۔ معمولی سے معمولی فرد

کی زندگی میں کبھی ایک صبح ایسی آتی ہے جو بہت عجیب و غریب ہوتی ہے حالانکہ اس دن صبح جری نے پہلے پہل کوئی بات نہیں دیکھی۔ دوسری صبحوں کی طرح یہ بھی ایک صبح تھی۔ وہی گاؤں تھا وہی گھر تھا، جاںڈی زمونشبی خانے سے جانوروں کے ڈکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اُٹھی اُس نے کھال میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ کھال میں آٹا نہیں تھا۔ اُس نے ایک دوسری کھال میں مکئی کے دانے بھرے اور صبح صبح آٹا پسانے چل دی کیونکہ اگر وہ پہلے جانوروں کو کھول دے گی تو آٹا کس وقت پسائے گی؟ اور صبح کا کھانا کب تیار ہوگا؟ اس کا باپ ابھی تک کھاٹ پر سویا ہوا تھا، وہ دبے پاؤں آنگن سے نکلی اور پل کی طرف ہولی۔ بالکل سینکڑوں ہزاروں لاکھوں صبحوں کی طرح آج بھی وہی صبح تھی، وہی رستہ تھا، وہی دھندلکا تھا، نالے کا وہی شور تھا، پل کے تختے اسی طرح اوس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بائیسواں تختہ اور پھر ستائیسواں تختہ اور پھر اٹھائیس سے تیس تک کے تختے پاؤں رکھنے میں ہلنے لگتے تھے اور ہر بار اُسے گمان ہوتا تھا کہ وہ اب گری لیکن جانے کب سے یہ لکڑی کے پل کے تختے ہل رہے تھے اور ہلنے کے باوجود اپنی جگہ سلامت تھے پہلے وہ لکڑی کے تختے گنا کرتی تھی اور ہلتے ہوئے تختوں پر بہت احتیاط سے قدم رکھا کرتی تھی لیکن اب اس نے یہ گنتی چھوڑ دی تھی۔ اب اس کے قدم خود بخود تیز تیز ہلتے جاتے قدموں نے تختے پہچان لیے تھے اور گنتی خود بخود ان پر نقش ہو گئی تھی۔ لیکن جری کو اس تبدیلی کا کوئی احساس نہیں ہوا کیونکہ یہ صبح دوسری صبحوں کی طرح جانی پہچانی یک رنگ اور ہموار تھی۔ وہ بہت آسانی سے پل سے گزر کر گھراٹ کے اندر چلی گئی۔

یہاں گھراٹ کے اندر جاتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور کچھ ناامید سی ہو گئی کیونکہ گھراٹ چل نہیں رہا تھا۔ جرا چکی کے پاٹ کھولے، ہتوڑا اور کیلا ہاتھ میں لیے پاٹ کے دندانے درست کر رہا تھا۔ اس نے جری کو اندر آتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اُس کی طرف دیکھا، دوسرے لمحے میں وہ نظریں نیچی کر کے کیلا ہتوڑے سے ٹھونک رہا تھا۔

جری نے کہا "آٹا پسانا ہے۔"

جرے نے کہا: "تو پھر میں کیا کروں؟"

جری نے کہا۔ "گھراٹ چلاؤ۔"

جرے نے کہا: "کیسے چلاؤں؟ دیکھتی نہیں ہو، پاٹ کی دھار ٹھیک کر رہا ہوں۔"

جری بولی: "لیکن مجھے جلد ہی واپس جانا ہوگا۔"

"ہاں، سبھی یہ کہتے ہیں۔" جرا بولا: "دس سال سے میں سن رہا ہوں گاؤں سے کوئی بھلا مانس یہ کہتے نہیں سنا گیا، میں جلدی میں نہیں ہوں۔ تم ذرا ٹھیر کر، آرام سے اطمینان سے آٹا پیسا دو۔ ایسا آج تک کبھی نہیں سنا۔" جرا بے اختیار ہنسنے لگا۔

جری بولی: "تم مجھ پر ہنستے ہو؟"

"نہیں۔ یہ تو میری عادت ہے۔ سب جانتے ہیں، کیا تم نہیں جانتی ہو؟" وہ پھر ہنسا

جری کو بہت غصہ آیا لیکن آٹا پیسنا تھا اور دُور دُور تک کہیں کوئی گھراٹ نہ تھا اس لیے چپ ہو رہی۔ جرا کیلے اور ہتوڑے سے پاٹ ٹھیک کرتا رہا۔ ہتوڑے اور کیلے کی ضربیں نالے کے شور سے مل کے جری کے کانوں میں ایک بے ہنگم گونج کا تاثر پیدا کرنے لگیں۔ وہ اب کے لجاجت سے بولی لیکن ایسی لجاجت جس میں دبا دبا غصہ بھی شامل تھا: "میں کب آٹا پیسا کے گھر لے جاؤں گی؟ کب روٹی پکاؤں گی؟ کب ڈھور ڈنگر کھول کر چرانے لے جاؤں گی؟ لوگوں نے ڈھور ڈنگر کھول بھی لیے ہوں گے۔"

جرے کو جری کی نحیف آواز کی لجاجت پر بہت ترس آیا۔ اُس نے ہتوڑے اور کیلے اٹھا کے ایک طرف رکھ دیئے اور چکی کے پاٹ احتیاط سے صاف کرنے لگا۔ ورنہ آٹے میں پتھر کے ذرّے جائیں گے۔ یہی سوچ کر جری بھی اُس کی مدد کرنے لگی تھوڑی دیر میں پاٹ صاف ہو گئے اب معاملہ اُوپر کا پاٹ گھما کر نچلے پاٹ پر رکھنے کا تھا۔ جری نے پھر مدد کرنی چاہی: "ٹھہر، میں خود ٹھیک کر لوں گا۔"

"نہیں میں بھی۔" جری نے مدد کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو ادھر سے ہاتھ لا۔"

"جری نے پاٹ کو ادھر سے سہارا دیا جدھر جرے نے اشارہ کیا تھا۔ دوسرے لمحے میں جرے نے بہت چابک دستی سے پاٹ گھما کر نچلے پاٹ پر رکھ دیا یکایک اُس کے کانوں میں ایک زور کی چیخ سنائی دی۔ "کیا ہوا؟" اس نے جری کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"میری انگلی! جری بمشکل اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ جرے نے فوراً پاٹ اٹھا دیا لیکن اتنی ذرا سی دیر میں انگلی کی آگے کی پور کچلی جا چکی تھی اور اُس سے لہو بہ رہا تھا۔

"میں تم سے کہہ رہا تھا، تم پاٹ کے قریب مت آؤ۔" جرا غصے میں بولا، جری رونے لگی۔ "تم عورتوں کو رونے کے سوا اور کچھ آتا بھی ہے؟" جرا جری کا شانہ پکڑ کر گھراٹ کے باہر لے گیا۔ جہاں گھراٹ کا پانی پن چکی سے نکل کر آبشار بناتے ہوئے ایک ٹھنڈی کول کی صورت میں دور تک بہتے ہوئے نیچے ندی میں جا ملتا تھا، یہاں جنگلی سونف، ہینگ اور دھتورے کی جھاڑیاں تھیں۔ جری کے نتھنوں میں پہلے تو جنگلی سونف کی خوشبو آئی، پھر دھتورے کے پھولوں کی کڑوی خوشبو آئی۔ پھر جب جرے نے اس کا خون آلود ہاتھ پکڑ کر کول کے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا تو اس کے دل و دماغ پر ایک عجیب خوشبو چھا گئی جو میٹھی بھی تھی اور کڑوی بھی اور نشیلی اور غنودگی آمیز بھی۔ ایسی عجیب خوشبو آج تک اس کے ذہن پر کبھی نہیں چھائی تھی۔ فرطِ جذبات سے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور اس کے احساسات کا بند بند ڈھیلا ہونے لگا اور اسے یہ معلوم نہیں ہوا کہ کب جرے نے اس کی انگلی کا لہو صاف کیا؟ کب اُس پر بوٹی کا لیپ کیا؟ کب اپنی قمیض پھاڑ کر اس پر کپڑے کا چیتھڑا باندھا۔ اُسے اُس وقت ہوش آیا جب اُس نے دیکھا کہ وہ جرے کے کندھے سے لگی کھڑی ہے۔ اور جرا اپنے ہاتھوں سے اُس کی آنکھوں کے آنسو پونچھ رہا ہے اور اس سے بہت نرم، سنہرے اور گہرے لہجے میں کہہ رہا ہے: "جری او... جری او جری...."

جری یکایک اُس کے کندھے سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی پہلے اس نے اپنی زخمی انگلی کی طرف دیکھا، پھر جرے کی طرف، پھر یکایک اس کی نگاہ سامنے کے پہاڑوں پر ٹھہری اور اُسے محسوس ہوا کہ پہاڑوں

پر جنگل کھڑے ہیں، جنگلوں میں درخت ہیں۔ درختوں پر انگور کی بیلیں ہیں، انگور کی بیلوں میں شہد کے چھتے ہیں اور شہد کے چھتوں پر نیلا آسمان جھکا ہوا دھیمے دھیمے سانس لے رہا ہے۔ جری نے حیرت اور استعجاب میں گم ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ ہر روز ہونے والی پرانی صبح نہیں تھی۔ یہ تو کوئی بالکل ہی نئی نویلی نازک سی صبح تھی۔ دھنک کی طرح سہانی، سجل اور سب رنگ۔ ایسی صبح جو آج تک اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی حالانکہ وہی وقت تھا۔ وہی سماں تھا، وہی نالا تھا، وہی سورج تھا۔ یکایک جری نے چونک کر جرے کی طرف دیکھا اور اس لمحے میں اسے احساس ہوا کہ نئی صبح سورج نہیں لاتا ہے، آدمی لاتا ہے۔ جرے نے کہا: "چلو آٹا پالو"۔

کون سی نئی بات ہے جو پرانی نہیں ہو جاتی جرے اور جری کی کہانی بھی پرانی ہو گئی چند روز تک گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی باتوں کا مرکز رہی۔ چند دنوں تک گاؤں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دل برماتی رہی، پھر جب جرے کے باپ نے اور جری کے باپ نے آپس میں مشورہ کر کے ان دونوں کے نکاح کے لیے ہاں کر دی تو بات ختم ہو گئی معمولی سی بات تھی معمولی سی محبت تھی معمولی سے طریقے سے شروع ہوئی۔ اگلے موسم خزاں میں نکاح کے موقع پر اسی معمولی جانے پہچانے انداز میں ختم ہو جائے گی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

لیکن جبا اور جری کے لیے بات ختم نہیں ہوئی۔ وہ تو ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔ نکاح کا فیصلہ ہونے کے بعد ہی جری کے باپ نے جری کا پن چکی پر جانا بند کر دیا کیونکہ یہی گاؤں کا رواج تھا اب تو شادی کے بعد ہی جری وہاں جا سکے گی۔ جری اب جہاں کہیں جرے کو آتا دیکھتی تو دور ہی سے گھونگھٹ نکال لیتی یا منہ موڑ کے کھڑی ہو جاتی۔ کیونکہ گاؤں کا یہی رواج تھا۔ رواج نے محبت کے جذبے پر بند باندھ کر اس میں گہرائی اور شدت پیدا کر دی۔ اب جری پل کے اس پار تھی اور جرا پل کے اس پار۔ کبھی کبھی وہ شام کے ڈھلتے سایوں میں اپنی پن چکی کے دروازے پر کھڑا ہو کر نیچے ندی کے تلے پر بھیڑ، بکریاں چرانے والی جری کو دیکھتا، دیکھتا، دیکھتا ہی رہتا۔ یہاں تک کہ جری

اس کی نگاہیں اپنے رخساروں پر محسوس کرتے لگتی۔ اس کے گال تمتما اُٹھتے اور وہ اتنی دور ہی سے گھونگھٹ نکال کر بھیڑ بکریوں کو سوسانٹی مارنے لگتی اور پن چکی کے دروازے پر کھڑا جبرا ایک مست آواز میں گانے لگتا:

کنیاں دے پار میرا چن وسدا ندی کے اس پار میرا چاند رہتا ہے، اور پھر کھل کھلا کر ہنسنے لگتا۔ وہ بلا وجہ ہنستا تھا۔ اور اب اور بھی بلا وجہ ہنسنے لگا تھا۔ لیکن لوگ جو پہلے اس کی ہنسی کی وجہ نہیں سمجھتے تھے، اب سمجھنے لگے، اور اس لیے اسے معاف کر دیتے تھے۔

پھر ایک طویل انتظار کے بعد چنار کے شعلہ رُخ پتوں والی خزاں آئی اور جبرا اور جری کے گھر میں شادی کے شادیانے بجنے لگے اور قبیلے کی عورتیں مختلف رسمیں ادا کرنے کے لیے پل کے اس پار سے اس پار جانے لگیں اور اس پار سے اس پار آنے لگیں۔ پل پر آمد و رفت بڑھ گئی۔ کیونکہ اگر ستار کا گھر پل کے اس پار تھا۔ تو درزی کا گھر اس پار تھا۔ اگر مانجھی بیر کا مزار ادھر تھا تو نکاح خوانی والے مولوی ابراہیم کی مسجد اُدھر تھی۔ عجیب گھما گھمی کا عالم تھا۔ پہاڑی راستے بہت تکلیف دہ اور دشوار گزار تھے۔ اس لیے دور دراز کے گاؤں سے دونوں قبیلوں کے رشتے دار مرد اور عورتیں بیاہ سے کئی دن پہلے چھپا نجل میں آگئے تھے اور جو نہیں آئے تھے انہیں بھی شادی سے چار دن پہلے ضرور پہنچنا تھا۔ جس دن مانجھی بیر کے مزار پر نیاز دی جانے والی تھی۔

نیاز کے دن جبرا خود سر پر چھان اٹھائے اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے گھر گھر نیاز بانٹتا رہا اور بزرگوں کی دعائیں لیتا رہا۔ دن بھر ڈھلوانیں اترتے اور گھاٹیاں چڑھنے کے بعد وہ بالکل تھک گیا۔ پھر بھی وہ دن بھر بہت خوش رہا۔ کئی بار نیاز بانٹنے کے سلسلے میں اسے جری کے گھر کے سامنے سے گزرنا پڑا اور شریر لڑکیوں کی نگاہوں اور ان سے زیادہ اُن کی شریر گالیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے گالیوں کا برا نہیں مانا بلکہ ہر بار جری کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس نے عجیب سی خوشی محسوس کی۔

آج اُسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ آج کے بعد وہ اب اس طرف اگلے چار روز

ے لئے نہیں آسکے گا اور آئے گا تو صرف شادی کے دن سہرا باندھ کر آسکے گا۔ اس لیے اس کا جی چاہتا تھا کہ آج جتنی بار وہ اس کے گھر کے سامنے سے گزر لے اچھا ہے۔ کیا ہوا اگر وہ جری کو نہیں دیکھ سکتا، وہ اس کے گھر کے سامنے سے تو گزر سکتا ہے۔ اس وقت اسے اس گھر کا ایک ایک کونا پیارا معلوم ہو رہا تھا۔

اسی شام جب وہ پن چکی کے دروازے پر کھڑا شادی کے خوش آیند تصورات میں گم تھا۔ اُس کے دوست دلاور نے پل سے بھاگتے ہوئے آکر اُسے بتایا کہ جری کے قبیلے کی عورتیں جری کو لے کے بیر مانجھی کے مزار پر چراغ جلانے کے لیے جا رہی ہیں، مانجھی بیر کا مزار پل کے اُس پار تھا اور جرے کی پن چکی پُل کے اتنی قریب تھی اس لیے ان عورتوں کے گزرنے کا رستہ اس پل کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر جرا چاہے تو کسی تردد کے بغیر اپنے دروازے پر انتظار کر کے اپنی جری کو نیا لباس زیب تن کیے بڑے مزار کی طرف جاتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ جرا بے حد خوش ہوا۔ اس نے اپنے دوست کو گلے سے لگا لیا! اور وہیں دروازے پر کھڑا کھڑا عورتوں کے جلوس کی راہ تکنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد جب شام کا دھندلکا گہرا ہونے لگا تو جرا اور دلاور نے عورتوں کی ایک لمبی قطار پل کے اُس پار چھا نجل کی دوسری ٹیکری سے نکل کر پل کی طرف آتی ہوئی دیکھی۔ ابھی وہ عورتیں بہت دور تھیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں پھر ان عورتوں کے گانے کی آواز نالے کے دونوں طرف کھڑے پہاڑوں سے ٹکرا کر گونج پیدا کرتی ہوئی سنائی دینے لگی عورتیں اب بھی بہت دور تھیں لیکن جرا اتنی دور سے بھی جری کی گہرے سرخ رنگ کی شلوار قمیض پہچان سکتا تھا۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور بہت بے چینی اور بے قراری سے عورتوں کو گھاٹی پر چڑھتے ہوئے پُل کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھنے لگا۔

عین اُسی وقت آسمان پر ڈوطیارے نمودار ہوئے۔ اُن کے شور اور گڑگڑاہٹ نے آس پاس کے پہاڑ اپنی دہشت ناک گونج سے تھرا دیئے۔ جرا اور دلاور نے آج تک ہوائی جہاز

ہیں دیکھا تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے کوئی آسمانی بلا سمجھا۔ وہ دونوں خوف اور دہشت سے زمین پر گر گئے اور اپنی آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ور کا دھماکہ ہوا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا۔ آخری دھماکے پر پل کے بیچ کا حصہ کڑ ڑاکر نیچے نالے میں گر گیا۔ نالے کا پانی بلیوں اوپر اچھلا۔ دھرتی کانپی۔ پھر ہوائی جہازوں کی ونج دور ہوتی گئی۔ آخر میں بالکل سناٹا چھا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب جرے نے آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ پل سے دور س پار خوف زدہ عورتیں چٹانوں میں دبکی پڑی ہیں۔ کچھ غالباً بے ہوش ہو گئی ہیں، کچھ وحشی ہرنیوں کی طرح دوڑتی ہوئی واپس اپنے گھروں کو بھاگ رہی ہیں۔ وہ بھاگتا ہوا پل کی طرف دوڑا در بانہیں پھیلا کر چلا چلا کر کہنے لگا: "جری... او... جری... تم کہاں ہو؟"

اُس کی آواز دور دور تک پہاڑوں سے گونج کر لوٹ آئی اور وہ پل پر بہت آگے نہ جا سکا۔ کیونکہ پل کا درمیانی حصہ ٹوٹ کر نیچے نالے میں گر چکا تھا۔ چند گھنٹوں بعد اس کے علاقے میں قبائلی پٹھان اور پاکستانی فوج کے جوان میجر عبدالعزیز کی قیادت میں پہنچے۔ جرے کی پن چکی بالکل پل پر ایک اچھے فوجی موقع پر واقع تھی، اس لیے انہوں نے اُس پر قبضہ کر کے اس پر فوجی چوکی قائم کر دی۔ رات بھر پل کے دونوں طرف گولا باری ہوتی رہی مشین گنیں چلتی رہیں۔ اور جب صبح ہوئی تو جرے نے دیکھا کہ اُس کا اپنا گاؤں آدھا اس طرف ہے اور آدھا اُس طرف ہے اور بیچ میں دو سلطنتوں کی فوجیں حائل ہیں۔

جرا سیاست کو بالکل نہیں سمجھتا تھا لیکن وہ اپنی شادی کو خوب سمجھتا تھا۔ اُسے یہ تو پتہ نہیں چلا کہ ایسا کیوں ہوا؟ لیکن اُسے یہ ضرور پتہ چل گیا کہ ایسا ہونے سے اس کی شادی ضرور رک گئی ہے، اس کا اسے بہت غصہ تھا۔ بہت رنج تھا، لیکن وہ ایک غریب آدمی تھا س لیے دو دن تو اپنا غصہ دل کے اندر ہی اندر چھپائے ہوئے بے قراری سے تڑپتا رہا، آخر جب اُسے کسی طرح چین نہ آیا تو وہ سپاہیوں سے منت کر کے کسی نہ کسی طرح میجر عبدالعزیز کے

کے سامنے پہنچ گیا۔

میجر عبدالعزیز شکل و صورت سے نوجوان، خوش رُو اور خوش گفتار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بہت دل جمعی سے جرے کو اپنے پاس بُلایا اور اُس سے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں جرا ہوں۔"

"جرا؟ جرا کسے کہتے ہیں۔"

"جرا چھوٹے آدمی کو کہتے ہیں۔"

"لیکن تم چھوٹے نہیں نظر آتے۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے نظر آتے ہو۔" میجر عبدالعزیز ہنسا پھر رُک کر کہنے لگا "اچھا بتاؤ، کیا کام ہے؟"

جرے نے رُک رُک کر کہا "حضور! کل میری شادی ہے!"

"اچھا تو کیا شادی کی دعوت دینے آئے ہو؟ ضرور آئیں گے بھئی۔ کہاں ہے تمہاری شادی؟"

جرے نے پل کے اس پار اشارہ کر کے کہا "وہاں ....."

میجر پہلے تو حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر ہنسنے لگا "ارے بے وقوف، دیکھتا نہیں ہے پل ٹوٹا پڑا ہے۔ تیری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"لیکن کل میری شادی ہے حضور!" جرے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا "کیا پُل پھر نہیں بن سکتا بیچ ہی میں سے تو ٹوٹا ہے حضور! اگر حضور ذرا سی کوشش....."

ارے بدھو، ہماری کوشش رد کرنے والے وہ سامنے چوکی جمائے بیٹھے ہیں۔ کیا سمجھتا ہے، تو اگر یہ پل صحیح سلامت ہوتا تو کیا ہم اس وقت تیری شادی کا تذکرہ سننے کے لیے یہاں بیٹھے رہتے۔ پونچھ میں نہ ہوتے؟"

میجر عبدالعزیز نے ہاتھ کے اشارے سے جرے کو رخصت کر دیا۔ جرا بہت مایوس ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ اس کی نظر دور جری کے گھر پر گئی۔ کل اس کی شادی ہے۔

شادی کی رات جری کے گھر سناٹا تھا۔ اس کا باپ چپ چاپ اپنے بستر میں دبکا پڑا

تھا۔ اُس کے رشتے دار گھاٹیوں اور ڈھلانوں سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے گاؤں بھاگ گئے تھے۔ جری اکیلی اپنے بستر پر پڑی رو رہی تھی۔ چاروں طرف ایک گہری خاموشی تھی کبھی کبھی گولیاں چلنے کی دھا دھا دھائیں سنائی دیتی۔ پھر ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔

اسی سناٹے میں جری دبے پاؤں اپنے گھر سے نکلی اور ندی کی طرف چلی، چھپتی ہوئی چٹانوں کی اوٹ میں سے گزرتی ہوئی دبکتی ہوئی۔ وہ نالے پر پہنچ گئی۔ وہ سوہنی نہیں تھی اس کے ہاتھ میں تیرنے کا مٹکا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دوسرے کنارے جانے کے لیے بے تاب ہو کر پانی میں گھس گئی۔ اگر اُس کا محبوب اِدھر نہیں آ سکتا تھا تو کیا ہوا؟ وہ اُدھر جائے گی۔ کیا ہوا اگر پل ٹوٹ چکا ہے؟ اور پانی کے ریلے طوفانی ہیں۔ اور اسے بہا کر کبھی نیچے لے جاتے ہیں کبھی چٹانوں پر پٹخ دیتے ہیں پھر بھی وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں زخمی ہو چکے ہیں۔ ٹخنوں اور گھٹنوں سے خون جاری ہے لیکن آج شادی کی رات ہے اور وہ اپنے شوہر کے پاس ضرور جائے گی۔ اور مولوی ابراہیم کی مسجد میں ضرور نکاح پڑھوائے گی۔ اور یہ نالہ اپنی تمام گھن گرج کے باوجود اُسے جانے سے نہیں روک سکتا۔ وہ سینکڑوں بار اس نالے میں تیری ہے۔ سینکڑوں بار اس نے اس کے پانی میں بہہ جانے والی بھیڑ، بکریاں بچائی ہیں۔ کیا وہ آج اپنی شادی پر نہیں جا سکتی؟ مانا کہ رات اندھیری ہے اور نالہ طوفانی اور خطرناک ہے تو کیا ہوا! اس کے دل میں تو کوئی اندھیرا نہیں ہے۔ وہاں تو کوئی خطرہ نہیں ہے، وہاں تو صرف یقین ہی یقین ہے

جری کئی بار چٹانوں سے ٹکرائی، کئی بار گری اور ڈوبی، غوطہ کھانے لگی۔ لیکن آخر دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس کے جسم کا بند بند دکھ رہا تھا جیسے ہر ہڈی کھنچ گئی ہو۔ اس کے دانت سردی سے کٹکٹا رہے تھے پھر بھی اُس نے اپنا حوصلہ مضبوط کیا اور آہستہ آہستہ دبک کے آگے بڑھنے لگی۔ یکایک ایک بھاری پتھر پاؤں کے نیچے سے پھسل کر دور نیچے تک کھائی میں آواز کرتا ہوا گر گیا۔ جری بہت مشکل سے گرتے گرتے بچی۔ یکایک اس کے کان میں آواز آئی، ہالٹ ہوکمز دیر۔

جری چٹان کے نیچے دبک گئی بہت دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی لیکن اب بیٹھے رہنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ سردی سے اعضا اکڑے جا رہے تھے، اگر وہ کچھ دیر اس چٹان کے نیچے دبکی رہی تو شاید سردی سے مر جائے گی۔ اس نے بہت مشکل سے چٹان کے نیچے سے اٹھنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا۔

عین اسی وقت ایک گولی ہوا میں تیرتی ہوئی آئی اور اس کی ہتھیلی چیرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ جری ایک چیخ مار کے بے ہوش ہو گئی۔

جب جری ہوش میں آئی تو اس نے اپنے آپ کو سپاہیوں کے نرغے میں پایا۔ سپاہی اسے ہوش میں آتے دیکھ کر میجر عبدالعزیز کے سامنے لے گئے۔ میجر عبدالعزیز بہت غصے میں تھا۔ "تم نے راستے کے وقت نالہ پار کرنے کی کوشش کی؟" جری نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم ہندوستان کی جاسوس ہو۔" "جاسوس کسے کہتے ہیں؟" جری نے بہت معصومیت سے پوچھا۔

"اتنی بھولی مت بنو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جاسوس کی سزا موت ہے۔" میجر عبدالعزیز غصے سے چیخا۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا! میں تو صرف پل ٹوٹ جانے کی وجہ سے نالہ پار کر کے آئی ہوں۔"

"کیوں آئی ہو؟" جری نے سر جھکا لیا۔ "صاف صاف بتاؤ۔"

جری بہت نحیف آواز میں بولی۔ "آج .... آج میری شادی ہونے والی تھی۔ جرے سے .... وہ پن چکی پر رہتا ہے، اسے بلا دو .... وہ مجھے پہچان لے گا۔ تمہیں سب بات بتا دے گا۔"

میجر سناٹے میں آ گیا۔ بہت دیر تک اس دبلی پتلی سانولی لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک سپاہی کو جرے کو بلانے کے لیے بھیجا۔ سپاہی تھوڑی دیر بعد اکیلا واپس آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جرارات سے غائب ہے۔

جری کے چہرے پر خوف اور ڈر کے باوجود امید کی جو روشنی باقی تھی۔ یکایک گم ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس کے ہونٹ سسکیوں سے کانپنے لگے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن زبان س کا ساتھ نہ دے سکی۔ اور وہ اسی وقت بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میجر عبدالعزیز نے حکم دیا کہ اس ڑکی کی اچھی طرح نگرانی کی جائے۔ اچھی غذا اور دوا بہم پہنچائی جائے یہ حکم دینے کے بعد وہ ہاں سے چلا گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اس کی روداد آپ کو صرف اس کہانی سے مل سکتی ہے۔ اس کی ئی شہادت، کوئی ثبوت ہندوستان اور پاکستان کے کسی اخبار سے مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ن دونوں ملکوں کے کسی فوجی ڈیسپیچ سے اس کا پتہ چل سکتا ہے کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ہوا، ہ اس حد تک ناقابل یقین اور محیر العقول ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے کسی فرد کو مشکل ہی سے اس پر یقین آئے گا۔ مجھے خود اس کا یقین نہ ہوتا، اگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں ان داروں سے نہ مل چکا ہوتا جنہوں نے یہ واقعہ خود مجھ سے بیان کیا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ میجر عبدالعزیز نے ایک خاص طریقے سے اپنی مخالف چوکی کے کمانڈر لیفٹیننٹ کپور چند سے گفتگو کی؟ کس طرح گفتگو کی؟ اسے بھی صیغہ راز میں رکھنا چاہتا ہوں صرف بتانا چاہتا ہوں کہ اس واقعے سے بہت عرصے پہلے عبدالعزیز اور کپور چند گورڈن کالج، راولپنڈی میں ساتھ پڑھے ہوئے تھے، برسوں ایک دوسرے کے ہم جماعت رہے، برسوں فوج میں بھی ساتھ رہے، پھر کپور چند ہندوستانی فوج میں رہ گئے۔ آج اتفاق سے وہ اپنی پرانی دوستی کے باوجود ایک دوسرے کی مخالف چوکیوں پر مشین گنیں لیے بیٹھے تھے۔ ان کی گفتگو کا دل چسپ تھی۔

عبدالعزیز "وہ پاکستان زندہ باد"

کپور چند "جے ہند جے ہند!"

عبدالعزیز "سناؤ کیا خبر ہے"

کپور چند: "سنا ڈیئر ڈو سا۔"

عبدالعزیز: "تیرا ایک جاسوس ہم نے پکڑا ہے۔ کیا بات ہے۔ اب تجھے کوئی مرد جاسوسی کے لیے نہیں ملتا جواب عورتوں کو بھیجنے لگا ہے لیکن مرد ہو یا عورت میں تو تیرے جاسوس کو گولی سے اڑا دوں گا۔"

کپور: "گھبراؤ نہیں، پیارے! ایک جاسوس ہم نے بھی پکڑ لیا ہے لیکن وہ عورت نہیں ہے، مرد ہے۔ اس لیے اُسے گولی مارنے میں اپنے کو کوئی پریشانی نہ ہوگی۔"

عبدالعزیز: "اُس جاسوس کا کیا نام ہے۔"

کپور چند: "اس کا نام جرا ہے۔"

عبدالعزیز: "کالے رنگ کا، ناٹے قد کا مضبوط جسم کا آدمی ہے۔"

کپور چند: "ہاں ہاں وہی۔"

عبدالعزیز: "ارے وہ جاسوس نہیں ہے۔"

کپور چند: "تو پھر کون ہے؟"

عبدالعزیز: "جس لڑکی کو میں نے پکڑا ہے، وہ بھی جاسوس نہیں ہے۔"

کپور چند: "تم کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔؟ ہمارے ساتھ تو خاصے عقل مند ہوا کرتے تھے۔"

عبدالعزیز: "سن او نے بدبختا!" اس کے بعد عبدالعزیز نے اسے ساری روداد سنائی اور اب وہ اس کہانی کے ٹکڑے جوڑنے میں بھی مزہ لینے لگے۔ "لیکن سب سے زیادہ لطف اس بات میں آیا کہ جس رات جری چھانجل کے اس پار سے نالا عبور کر کے ادھر آئی، اُسی رات جرا بھی محبت سے بے چین، بے قرار ہو کر اِدھر سے اُدھر چلا گیا۔"

کپور چند: "گویا دونوں محبوب پھر الگ ہیں!"

یہ کہہ کر کپور چند زور زور سے ہنسنے لگا۔ عبدالعزیز نے ذرا سنجیدہ ہو کر اُس سے پوچھا: "اب کیا کرنا چاہیئے۔"

کپور چند: "میرے خیال میں تو ایک دوسرے کی شادی کر دینی چاہیے۔ تم اس لڑکی کو میرے ہاں بھجوا دو۔ میں گولی نہ چلانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ آخر وہ لڑکی میرے علاقے کی ہے۔ شادی میرے علاقے میں ہو گی۔"

عبدالعزیز: "واہ یہ کیوں۔ دولھا میرے علاقے کا ہے۔ یہ شادی میرے علاقے میں ہو گی۔ تم اس پن چکی والے کو میرے ہاں بھیج دو۔"

کپور چند: "یہ مجھے منظور نہیں۔"

اس کے تھوڑی دیر بعد یہ سلسلہ گفتگو منقطع ہو گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر میجر عبدالعزیز اور کپور چند کی گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔

عبدالعزیز: "ارے وہ لڑکی بہت بری حالت میں ہے۔ ڈاکٹروں کے خیال میں اسے سخت شاک پہنچا ہے۔"

کپور چند: "اسے میرے ہاں بھیج دو۔ تم سے کہہ چکا ہوں۔"

عبدالعزیز: "بے کار بات کرتے ہو۔"

کپور چند: "تمہاری مرضی۔ جے ہند!"

عبدالعزیز: "پاکستان زندہ باد مگر ایک بات، ایک ترکیب اور سنو پل کا شمالی حصہ ہمارے قبضے میں ہے، جنوبی حصہ تمہارے پاس ہے لیکن بیچ کا حصہ جو ٹوٹا ہوا ہے، وہ نہ پاکستان کے پاس ہے۔ نہ ہندوستان کے پاس ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ وہ ٹوٹا ہوا حصہ مکمل کرا کے۔۔۔۔"

کپور چند: "بہت خوب! میں تمہاری چال سمجھتا ہوں۔"

عبدالعزیز: "خدا کی قسم یہ کوئی چال نہیں ہے۔ تم جو چاہے مجھ سے قسم لے لو لیکن میں چاہتا ہوں ان دونوں کی شادی ضرور ہو جائے اور اس جگہ ہو جہاں میرا خیمہ بھی صاف رہے اور تم پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔ یہ پل کی درمیانی جگہ سب سے اچھی رہے گی۔"

کپور چند: "اچھا مگر شادی کے بعد یہ پل پھر اڑا دیا جائے گا۔"

عبدالعزیز "مجھے منظور ہے لیکن دیکھو کسی کو پتہ نہ چلے۔ کھاڈ گورڈن کالج کی اس لڑکی کی قسم ۔۔۔"

کپور چند "ہائے کیوں اُس کی یاد دلاتے ہو۔۔۔ یہ جری کیسی ہے؟"

عبدالعزیز "اس کی صورت نہ دیکھو، اس کا دل دیکھو۔۔۔"

کپور چند "تو آج رات کو مولوی بلا بھیجو لیکن یہ یاد رہے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو، نہیں تو"

عبدالعزیز "جانتے ہو کس غارت گر کی قسم کھائی ہے؟" سلسلہ گفتگو پھر منقطع ہو گیا

اس روز چھانگل کے لوگوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ پل کا درمیانی حصہ چھانگل کے اس پار اور اس پار دونوں طرف بسنے والے لوگوں نے اپنی محنت سے ٹھیک کر لیا۔ دونوں طرف کے سپاہی براتی بنے ہوئے گھوم رہے تھے۔ پل پر روشنی تھی اور نغمہ تھا خوب صورتی تھی اور امن تھا۔ بندوقیں چپ تھیں اور توپوں کے دہانے خاموش تھے۔ آج کوئی کسی کو گولی مارنے کے لیے آمادہ نہیں تھا چاروں طرف ایک عجیب فضا تھی اور مولوی ابراہیم بہت ہی پاکیزہ لہجے میں قرأت سے خطبہ پڑھ رہا تھا۔

اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ

(نکاح میری سنت ہے اور جس نے بھی میری سنت سے انحراف کیا وہ میرا نہیں)

آج چھانگل کا پل کہیں نہیں ہے۔ مخالف فوجیں پل کے شمالی حصے پر مشین گنوں کے گھونسلے جمائے بہت ہی مستعدی سے لڑنے مارنے کو تیار بیٹھی ہیں۔

لیکن ہیر اور جری کی شادی ہو گئی ہے اور چھانگل کے لوگوں نے ایک اور پل بنا لیا ہے یہ جو دلوں کے اندر سے گزرتا ہے اور جس کا کوئی تختہ نہیں ہلتا۔

دُنیا آمچی آہے

واسنت مراٹھے کی شادی شاردا دیسائی سے ہوئی تھی۔ شاردا گجراتن تھی اور واسنت مراٹھا تھا۔ اور یہ شادی کبھی نہ ہوتی اگر واسنت کے باپ رام مراٹھے کا چمبور میں لالٹین بنانے کا کارخانہ نہ ہوتا اور اس کے کارخانے کے قریب شاردا کا باپ مگن لال دیسائی اپنا کانچ کا کارخانہ کھڑا نہ کرتا۔ رام مراٹھے کے کارخانے میں لالٹین بنانے کا سارا سامان تیار ہوتا تھا۔ سوائے کانچ کے ہنڈے کے، اور یہ ہنڈا دیسائی گلاس ورکس سے آتا تھا۔ اس لئے واسنت اور شاردا کی شادی کیا ہوئی گویا گھر کی لالٹین مکمل ہوگئی۔

واسنت ناٹے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان تھا اور دُور سے بالکل اپنے کارخانے کی لالٹین کی طرح مضبوط، چوڑا اور سانولا نظر آتا تھا۔ شاردا گورے رنگ کی، لانبے قد کی بڑی بڑی آنکھوں والی، نازک بدن، کانچ کی گڑیا سی دکھائی دیتی تھی۔ شادی کے بعد دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی۔ کیوں کہ ہندوستان میں شادی پہلے ہوتی ہے۔ محبت بعد میں ہوتی ہے یورپ میں محبت پہلے ہوتی ہے شادی بعد میں ہوتی ہے۔ بچہ دونوں صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔

واسنت اور شاردا کے دو بچے تھے۔ لکشمن اور کملا۔ لکشمن چھ سال کا تھا۔ کملا چار سال کی تھی۔ دونوں میاں بیوی بڑے مزے میں اپنے بچوں کے ساتھ چار بیڈ روم کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے جس کا نام لالٹین نواس تھا۔

یہ فلیٹ مگن لال دیسائی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔ جس دن لکشمن پیدا ہوا۔ اس دن اس کے دادا رام مراٹھے نے اپنے پوتے کے پیدا ہونے کی خوشی میں لالٹینوں کے ساتھ لوہے کے ڈرم بنانے کا کارخانہ بھی چالو کر دیا۔ پھر جس دن شاردا کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اس دن لڑکی کے نانا نے تھرمامیٹر بنانے کا کارخانہ بھی شروع کر دیا۔ اور مگن لال دیسائی نے اپنے کارخانے کا سب سے پہلا بیرومیٹر واسنت اور شاردا کے گھر میں لگا دیا تاکہ دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ٹمپریچر کا اندازہ ہوتا رہے۔

شادی کی زندگی کے سات سال بڑے مزے میں کٹ گئے۔ پھر جس دن رزگار ریڈی نے صابن بنانے کا کارخانہ سائن میں چالو کیا اور سردار چانن سنگھ نے دادر میں دی گریٹ مون شائن فلم کمپنی کا مہورت کیا۔ اسی دن بمبئی میں ایک طوفان اُٹھا۔ ہنگامہ ہوا، گولی چلی، ٹراموں پر پتھراؤ ہوا، سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے اور دوسرے دن اخبار دیکھ کر واسنت کی آنکھیں غصّے سے لال ہو گئیں اور اس نے اخبار کو زور سے ناشتے کی میز پر پٹخ دیا اور بولا "چھی"؟

"سوں چھے؟" شاردا بولی۔

واسنت نے کہا "یہ اخبار بولتا ہے کہ بمبئی اکیلی مراٹھوں کی نہیں ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ بمبئی ہماری ہے۔ ہمیشہ ہماری رہے گی۔ ہم مراٹھوں کی" شاردا نرمی سے بولی "ہاں، ہاں بمبئی تمہاری ہے، بے شک تمہاری ہے لیکن وہ ہماری بھی تو ہے۔ ہم گجراتیوں کی۔"

"واہ بمبئی تمہاری کیسے ہو گئی۔ بمبئی تو مراٹھوں کی ہے۔"

"نہیں وہ گجراتیوں کی ہے۔" شاردا غصّے سے بولی "یہ سارا شہر ہم نے بنایا ہے۔ اس کا بزنس ہم نے چلایا ہے۔ اس کا کارخانہ ہم نے لگایا ہے۔۔۔

تم کدھر سے حق جتانے لگے ہماری بمبئی پر؟"

"شہر تم نے بنایا ہے؟ لیکن اس شہر کو بسایا کس نے ہے؟ بزنس ضرور تم نے چلایا ہے لیکن وہ بزنس پھیلایا کس نے ہے؟ کارخانہ لگایا تم نے ہے لیکن کارخانے میں کام کون کرتا ہے؟ ہمارے مہاراشٹر کا مزدور۔ سمجھیں؟ بمبئی آمچی آہے" واسنت نے آملیٹ چھری سے کاٹتے ہوئے کہا۔

"نا بمبئی ہماری چھے" اشاردا دیوی ٹیبل پر نمک چھڑک کر بولی "تمی گدی کھوٹا بولتا!"

"تمے جسے کہو چھے، تے چھٹھو چھے۔ شدن چھوڑو چھے!"

"بمبئی آمچی آہے!"

"نا۔ ماری چھے!"

واسنت نے چائے کا چمچا زور سے میز پر پٹخ دیا۔ شاردا نے چھری کانٹے پلیٹ میں پھینک دیئے۔ دونوں ناشتے کی میز سے اُٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں جا کر بند ہو گئے۔ بچے سہم کر سسکنے لگے۔ جب اس جھگڑے کی خبر مگن لال دیسائی اور رام مراٹھے تک پہنچی تو دونوں بوڑھے نوجوان میاں بیوی کی حماقت پر بڑے ہنسے۔ رام مراٹھے نے مسکرا کر کہا "مگن بھائی! ہمارے بچے بھی کس قدر بھولے ہیں۔ نہیں جانتے کہ مہاراشٹر بن جائے، چاہے گجرات الگ ہو جائے مگر گجراتیوں کو مراٹھوں کی ضرورت رہے گی اور مراٹھوں کو گجراتیوں کی۔"

"ہاں جیسے تمہاری لالٹین کو میرے کانچ کے ہنڈے کی ضرورت ہوتی ہے اور میرے کانچ کے ہنڈے کو تمہاری لالٹین کی۔" مگن لال دیسائی نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"بالکل"۔ رام مراٹھا سر ہلا کر بولا۔

"تو چلو! چل کر ان دونوں بے وقوفوں کو سمجھائیں" مگن لال دیسائی نے تجویز پیش کی۔ اور دونوں بزرگ اسی وقت اپنی اپنی آرام کرسیوں سے اُٹھے اور موٹر میں بیٹھ کر لالٹین نواس پہنچے اور وہاں جاکر واسنت اور شاردا کو سامنے بٹھا کر سمجھانے لگے۔ واسنت کے باپ نے اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا "شرم نہیں آتی۔ میری بہو کو تنگ کرتا ہے۔" مگن بھائی نے شاردا سے کہا "نالائق اپنے پتی سے جھگڑا کرتی ہے"؟

"میں تو جھگڑا نہیں کرتی پتا جی!" شاردا سسکتے ہوئے بولی "یہی جھگڑا کرتے ہیں بولتے ہیں تم گجراتی لوگ بہت خراب لوگ ہوتے ہو ہمیشہ ہم مراٹھوں کا حق مارتے رہتے ہو"

"ایسا"، مگن لال دیسائی چوکنا ہو کر واسنت کی طرف دیکھنے لگا۔ واسنت نے سر جھکا کر اپنے باپ سے کہا "پتا جی! شاردا کہتی ہے کہ اکھا بمبئی گجراتی لوگوں نے بنایا ہے اور اس شہر کا سارا بزنس اس کا سارا دھندا گجراتی لوگ چلاتے ہیں شاردا بولتی ہے کہ ہم گجراتی لوگ نہ ہوں تو مراٹھے بھوکے مر جائیں"

"ایسا"؟ رام مراٹھے نے شاردا کی طرف گھور کر دیکھا اور گرج کر پوچھا۔ "کیا تم نے ایسا کہا تھا"؟ اور یہ کہتے کہتے رام مراٹھے غصّے سے کھڑا ہو گیا۔ پیشتر اس کے کہ شاردا کوئی جواب دیتی اس کے باپ نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور خود رام مراٹھے کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا "اگر میری بیٹی نے نہیں بھی کہا تو میں اب کہتا ہوں کہ اس نے جو کہا ہے وہ بالکل ٹھیک کہا ہے"

رام مراٹھے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا اور بولا "اگر تمہاری بیٹی نے ٹھیک کہا ہے تو میں کہتا ہوں میرے بیٹے نے بھی جو کہا ہے سو فیصد ٹھیک ہے، بمبئی اچھی آہے"

"بمبئی ہماری چھے" مگن لال دیسائی نے چلا کر کہا۔ اور شاردا کا ہاتھ پکڑ کر غصّے سے بولا "چل بیٹی! اپنے گھر چل، ہم کوئی ایسے گرے پڑے نہیں ہیں کہ تجھے پناہ نہ دے سکیں"

"جاتے ہو تو جاؤ" رام مراٹھے اپنی چھڑی ہوا میں گھما کر بولا "مگر کہے دیتا ہوں دوبارہ اس گھر میں گھسے تو ٹانگیں توڑ دوں گا"

"بڑے آئے ٹانگیں توڑنے والے۔ جیسے بمبئی تمہارے باپ کی ہے" واسنت کا باپ گرج کر بولا "جے مہاراشٹر"

"جے مہاگجرات" مگن لال دیسائی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور اپنی بیٹی اور بچوں کو لے کر فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

☼

آج واسنت کے فلیٹ میں اندھیرا تھا۔ شاردا کو گھر چھوڑے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ ایک سال سے واسنت نے نہ شاردا کی صورت دیکھی تھی نہ اپنے بچوں کی۔ اس ایک سال میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے آندولن چلے۔ آپس کے لڑائی جھگڑے ہوئے مگر آخر میں سمجھوتا ہو گیا۔ بمبئی کا صوبہ تقسیم ہو گیا۔ گجرات کا صوبہ الگ بن گیا۔ مہاراشٹر کا صوبہ الگ وجود میں آیا۔ پارلیمنٹ نے بھی بل پاس کر دیا۔ ہر چیز طے ہو گئی۔ ختم ہو گئی۔ ساری نفرتیں اور کدورتیں دھو ڈالی گئیں۔ اور آج ۲۹ اپریل کو تو روشنیوں کا دن تھا۔ گانے، ناچ، جلسے، جلوس، ہنگامے، غل غپاڑے، تماشے، مشاعرے، کوی سمیلن نعرے، ڈھول تاشے، باجے گاجے۔ لوگوں نے آج ساری بمبئی میں روشنی کی تھی۔ اور اُسے دُلہن کی طرح سجا دیا تھا۔ مگر واسنت کے اپنے فلیٹ میں اندھیرا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ سڑکوں کے دورویہ درختوں پر بجلی کے ہزاروں قمقمے جگمگا رہے تھے، ہواؤں میں خوشبو تھی۔ فضاؤں میں قہقہے تھے۔ عورتیں آنکھوں میں کاجل لگائے جوڑے میں شینوتی کی دیپی سجائے ہوئے بچوں کو انگلی سے لگائے اس کے فلیٹ کے نیچے سے گذر رہی تھیں۔

واسنت کا دل اپنی بیوی بچوں کی یاد سے بے چین ہو اُٹھا۔ کئی بار اس سے پہلے

بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ احمد آباد جائے اور اپنی بیوی سے صُلح کر کے اسے اپنے بچّوں سمیت واپس بُلا لائے۔ مگر ہر بار ایک جھوٹی عزّت اس کا دامن پکڑ کر روک لیتی تھی آج اُسے نہ صرف شارد بلکہ اپنے پیارے بچّے بھی کتنے یاد آ رہے تھے۔ ننھا لکشمن اور بھولی کملا۔ ان دونوں معصوم بچّوں کی صورتیں گویا اس کے دل کا دامن پکڑنے لگیں اور وہ سوچنے لگا بھلا اس نے کیوں اپنی بیوی سے جھگڑا کیا۔ بلا وجہ ہی اپنا گھر برباد کیا۔ بھلا کیوں؟ بمبئی کے مہاراشٹر میں آجانے سے کیا، اس کی صورت بدل گئی ہے؟ کیا اس کا میرین ڈرائیو اُٹھ کر پونا چلا گیا ہے؟ کیا ٹرامبوے کا ایکٹر ناگپور بھیج دیا گیا؟ کیا فورٹ کا علاقہ ناگپاڑے میں آباد کر دیا گیا ہے؟ کیا آج بھی لوگ سڑکوں پر نہیں سوتے؟ غلیظ کھولیوں میں نہیں رہتے؟ دُکھ اور درد کا درماں نہیں ڈھونڈتے؟ مفلسی اور موت کا سامنا نہیں کرتے؟ پھر کس لئے اس نے اس قدر جذباتی ہو کر اپنی پیاری بیوی سے جھگڑا کر لیا۔ اور اپنے بچّوں کو اپنے آپ سے دُور کر دیا؟

آج ہر گھر میں روشنی ہے، صرف اس کے گھر میں اندھیرا ہے۔ اور اس کے دِل میں ہمّت باقی نہیں ہے کہ اپنے اندھیرے کونے سے اُٹھ کر ایک بتّی بھی روشن کر دے۔ وہ دیر تک اسی طرح جلتا، کڑھتا، سوچتا رہا اور اندھیرے کونے میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے، ٹانگیں سکیڑے لیٹا رہا اور اس کے چاروں طرف خوشیوں کا جلوس گزرتا رہا۔ دو تین بار اس کے کانوں میں آواز سی آئی جیسے کوئی اس کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو۔ مگر آج وہ کسی سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ اس لئے وہ اٹھ کر دروازے تک بھی نہ گیا۔ جو بھی ہوگا خود ہی دروازہ پیٹ کر چلا جائے گا۔ یا بہت ہی ڈھیٹ ہوگا تو خود ہی اندر آجائے گا۔ پھر یکایک اس کے کانوں میں ایک آواز آئی "ارے آج خوشیوں کے دن یہاں اس قدر اندھیرا کیوں ہے؟" اور اس آواز کے ساتھ ساتھ ایک بتّی جلی اور اس بتّی کی روشنی میں واسنت نے دیکھا کہ دروازے میں شارد بچّوں

کو انگلی سے لگائے کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے۔

ایک لمحے کے لیے چونک کر اس نے شاردا کی طرف دیکھا، جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ پھر وہ یک لخت اپنی کرسی سے اُٹھا اور دوڑ کر دروازے کی طرف گیا اور جھپٹ کر اس نے جلدی سے اپنے دونوں بچوں کو گود میں اُٹھا لیا اور انہیں پیار کرنے لگا۔

شاردا نے یکایک منہ پھیر لیا اور بالکونی کے جنگلے کے قریب جا کر بولی۔

"شرم نہیں آتی ہے لوگوں کو مہاراشٹر کے جنم دن پر میرے گھر میں اندھیرا کرتے ہیں۔"

واسنت کچھ نہ بولا مگر اس کی نگاہوں میں خوشی کے دیئے قطار اندر قطار مسکرانے لگے۔ پھر وہ دھیرے سے اپنی بیوی کے قریب گیا اور سر جھکا کے بولا "شاردا! مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آ گئی ہو؟"

شاردا نے بالکونی پر مٹی کے دیوں میں تیل ڈالتے ہوئے کہا "کیوں نہ آتی! کیا یہ میرا گھر نہیں ہے؟ کیا یہ بمبئی شہر میرا نہیں ہے؟" شاردا نے بے خوف نگاہوں سے واسنت کی طرف دیکھ کر کہا "بمبئی آپ کی ہے۔"

واسنت نے مسکرا کر کہا "تمہاری ہے! تمہاری ہے! نہ صرف بمبئی تمہاری ہے، یہ گھر بھی تیرا ہے اور میں خود بھی تیرا ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو اسٹامپ پیپر پر لکھوا لو۔"

شاردا کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔ اس نے اپنا سر واسنت کے کندھے پر رکھ دیا اور جذبات سے کانپتی ہوئی بولی "میں نے غلطی کی جو یہاں سے چلی گئی۔ میں بھول گئی کہ اس دیس میں نہ کچھ تیرا ہے نہ میرا یہ سارا دیس ہمارا ہے۔ اور یہاں جتنے بھی مراٹھے اور گجراتی، پنجابی اور سندھی، بنگالی، نیپالی ہندو اور مسلمان، سکھ اور عیسائی، یہودی اور پارسی رہتے ہیں، ایک ہی

ماں کے بیٹے ہیں۔ گو صوبے الگ الگ ہیں مگر گھر ایک ہے۔ میں گجراتی ہوں تم مراٹھے ہو مگر ہم دونوں کا مستقبل ایک ہے۔"

واسنت نے مسکرا کر شاردا کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر بچوں کو لے کر باہر بالکونی میں آ گیا جہاں اُن کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی۔

بدنظر

اب یہ بات دوستوں پر کھل چکی تھی کہ مہتہ چاہتا ہے کہ اس کا باپ جلد سے جلد مر جائے۔ ندر کانت مہتہ ہمارا دوست تھا اور ہمسایہ بھی۔ وہ دبلا پتلا، اونچے لانبے قد کا ادھیڑ عمر کا ایک دلال ما جو کرائے کے مکانوں یا اونر شپ فلیٹوں کی دلالی کرتا تھا اور پالی پارک میں رہتا تھا۔

پالی پارک کے نئے بنگلوں میں جتنے کرائے دار آتے تھے جو نئے بنگلے بن رہے تھے ان کے کرائے دار بھی اسی کی معرفت آئیں گے اس کا بھی ہمیں علم ما کیونکہ چندر کانت مہتہ سیٹھ خوب چند کو خوب اچھی طرح سے جانتا تھا اور سیٹھ خوب ران تمام بنگلوں کا مالک تھا۔ اسی لئے چندر کانت مہتہ نے دن رات خوشامد کر کے اور مسکہ لگا ر سیٹھ خوب چند کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا حالانکہ سیٹھ خوب چند بے حد بدزبان اور تیز مزاج تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ کھردری سے کھردری طبیعت میں خوشامد کا مکھن لگانے سے ا ہٹ پیدا ہو جاتی ہے! اور اگر نہیں جانتے ہیں تو ایک دن جان جائیں گے۔

بہر حال چندر کانت مہتہ کو زمانے کی تلخیوں نے یہ گر اچھی طرح سکھا دیا تھا لیکن ا دنیا میں صرف خوشامد کافی نہیں ہے۔ نئے مکانوں کی تعمیر بھی ضروری ہے، اگر نئے ان نہ بنیں گے تو نئے کرایہ داران میں کیسے آکر بسیں گے؟ ان دنوں مکانوں کی قلت کا یہ حال کہ ایک بار جو کرائے دار مکان میں آ کے بس گیا، بس وہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لیتا پچھلے انے میں سنا ہے کہ کرائے دار انتہائی شریف اور مہذب ہوا کرتے تھے۔ مالک مکان کے ی نوٹس پر گھر خالی کر کے چلے جایا کرتے تھے۔ آج کل کے کرائے دار دس بار مقدمہ کرنے پر نہیں نکلتے کوئی انسانیت ہے؟ آخر چندر کانت مہتہ کہاں جائے؟ اسے ہر ماہ گھر خرچ کے لئے ایک ہزار روپیہ چاہیئے۔ اور مکانوں کی دلالی سے اور دوسرے چھوٹے موٹے

کاموں سے اسے مشکل سے چار سو پانچ سو روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ باقی رقم وہ ہر ماہ کہاں سے لائے۔ اسلئے وہ بیچارہ ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔ کیونکہ چندر کانت مہتہ کے پاس ایک خوبصورت گڑیا سی بیوی ہے اور خوبصورت ننھی سی کار ہے۔ اس لئے جب وہ بڑے پیار سے "بے بی" کہہ کر آواز دیتا ہے تو اکثر یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اپنی بیوی کو بلا رہا ہے یا اپنی کار کو۔ اجب ایک گھر میں دو خوبصورت چیزیں جمع ہو جائیں تو اسی طرح کی گڑبڑ ہوتی ہے۔ خصوصاً جب صاحب کو ایک ہی نام سے پکارنے کی عادت ہو۔ اس وقت ہم لوگ جو اس کے ہمسائے ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ محض اس کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا کرتے ہیں کہ روئے سخن کدھر ہے۔

"آج میں نے بے بی کیلئے ایک عمدہ ساڑی خریدی ہے"۔

"ظاہر ہے اس وقت بے بی سے مطلب ہے اس کی بیوی"۔

ورنہ گاڑی کو ساڑی کون پہناتا ہے۔ ساڑی کو گاڑی میں تو سبھی بٹھاتے ہیں لیکن گاڑی کو ساڑی کون پہناتا ہے؟ یا وہ جب ہم سے یوں ہمکلام ہوتا ہے۔

اجی کل ہی کی بات ہے کہ میں اپنی بے بی کو دھو رہا تھا کہ اتنے میں .....

ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اس وقت بے بی سے مراد گاڑی ہے۔ بیوی نہیں ہے لیکن کبھی کبھی بڑا گھپلا ہوتا ہے۔

"میری بے بی کے چوٹ آگئی ہے"

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ مسز مہتہ کے پاؤں میں موچ آگئی ہے یا کار کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔ یا۔

"آج بے بی نے راستے میں بہت پریشان کیا"۔

اب راستے میں بیوی بھی پریشان کر سکتی ہے اور گاڑی بھی اور ہم سوچتے، رہ جاتے ہیں کہ کیا بات ہوئی۔ بیوی کے مزاج کا پارہ تیز تھا یا گاڑی کی بیٹری ڈاؤن تھی

ایسے موقعوں پر بھی انتہائی سنجیدگی سے سر ہلا کر صرف ہوں ہاں کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

بے بی کے علاوہ چندر کانت مہتہ کا پسندیدہ موضوع اس کے باپ کی علالت ہے اس کا باپ چمن مہتہ پچاس برس کا بوڑھا ہے بیٹے کی طرح دبلا پتلا، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ سوکھا۔ اپنے بیٹے ہی کی طرح چمن مہتہ لانبا ہے۔ لیکن اس کی آواز اس شدید علالت کے باوجود پاٹ دار اور کراری ہے۔ بیٹے کی آواز میٹھی اور لچک دار ہے۔ چندر کانت کی آواز سنتے ہی خیال ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو یا تو دلال ہونا چاہیئے۔ یا شہد کی مکھیاں پالنے کا بیوپار کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے باپ چمن مہتہ کی کراری آواز سے اس کے دولت مند ہونے اس کے کنجوس ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ باپ بیٹے دونوں ایک بنگلے میں پالی پارک میں رہتے تھے۔ چندر کانت مہتہ اور مسز مہتہ دونوں دن رات بڈھے کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ بڈھے کا سارا جسم سوکھ گیا ہے پیروں پر ورم آ گیا ہے۔ آنکھوں سے بہت کم دکھائی دینے لگا ہے۔ لیکن پھر بھی سانس کی آمد و رفت جاری ہے اور گردن اتنی سوکھ گئی ہے کہ سانس نرخرے سے آتا جاتا دکھائی دیتا ہے۔ بڈھا اس پر بھی زندہ ہے اور جیئے جاتا ہے اور بیماری کا مقابلہ کیئے جاتا ہے۔ اس کے دو بیٹے اور بھی ہیں لیکن اب وہ اپنے بڈھے باپ کی خدمت نہیں کرتے کیونکہ بڈھا تو دس سال سے بیمار ہے اور وہ دونوں بیٹے پہلے ہی چار سالوں میں اس کی خدمت کرتے کرتے تھک گئے۔ ہر جذبے کی ایک میعاد ہوتی ہے ایک عمر ہوتی ہے۔ جہاں پہنچ کر وہ دم توڑ دیتا ہے۔ ان دو بیٹوں کے ساتھ یہی ہوا۔ آخر میں بڈھے نے چندر کانت مہتہ کی خدمت سے خوش ہو کر اپنے دونوں بیٹوں کو جائیداد سے بے دخل کر دیا کیوں کہ یہ جائیداد پشتینی نہ تھی بڈھے کی اپنی پیدا کردہ تھی۔ دوسرے دونوں بیٹوں کو اس کا بہت غم تھا اور وہ دونوں غم و غصے میں آ کر اپنے بھائی چندر کانت مہتہ کو مورد الزام ٹھیراتے تھے۔ اور اکثر لوگوں سے کہتے پھرتے تھے کہ ہمارے بھائی نے جائیداد کی لالچ میں آ کر ہمارا گلا کاٹا ہے۔ چندر کانت مہتہ نہایت خاموشی سے ان کی باتیں، ان کی طعنے سنتا اور بڈھے باپ کی

خدمت کئے جاتا۔ آج چھ سال سے وہ اپنے بڈھے باپ کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ کوئی فرمانبردار سے فرمانبردار بیٹا بھی اپنے باپ کی ایسی خدمت نہیں کر سکتا جتنی خدمت چندر کانت مہتہ کرتا تھا۔ اور وہ بڑے فخر سے اپنے اس کارنامے کو دوستوں میں بیان کرتا تھا۔ چندر کانت خاصا مذہبی آدمی بھی تھا اور اسے لیکچر سننے اور سنانے کا بھی شوق تھا۔ اکثر دھارمک مجلسوں میں وہ رامائن کی مثالیں دیتے ہوئے اپنی تقریر میں ماں باپ کی خدمت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اپنے بڈھے باپ کی علالت کا مزور ذکر کرتا تھا۔ لوگ اس کی اس بے ضرر سی کمزوری کو معاف کر دیتے تھے۔ آخر جو بیٹا اتنے سال باپ کی خدمت کرے گا کیا اسے خدمت کے صلے میں خودستائی کے دو لفظ کہنے کا بھی حق نہ ہوگا؟

چندر کانت مہتہ اور مسز مہتہ بڈھے باپ کے خریدے ہوئے بنگلے میں رہتے تھے کسی زمانے میں بڈھے باپ کو پرانے ٹائپ کا فرنیچر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے اس کا بنگلہ اس قسم کے فرنیچر سے پٹا پڑا تھا۔ مسز مہتہ اور اپنے بیٹے کو بوڑھے نے دو کمرے دے رکھے تھے۔ باقی سب کمروں میں اس کا سامان پڑا تھا اور کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر ادھر سے ادھر نہ ہو سکتی تھی مسز مہتہ اس بات سے بہت کڑھتی تھیں اور کبھی کبھار اپنی سہیلیوں سے گفتگو کرتے وقت ان کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے۔

"دیکھنا ایک دن میں اس بنگلے کو کیسا سجاؤں گی"

اس سجانے کے پس منظر میں چھپے ہوئے اس کے دل کے ارمان کھل کر سامنے آجاتے تھے۔ لیکن یوں کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا۔ ورنہ مسز مہتہ ایسے معاملات میں بہت محتاط رہتی تھی اور بڈھے کو بھی اس بات کا پورا یقین تھا کہ اس کا بیٹا اور اسکی بہو دوسرے بیٹوں کی طرح نہیں۔ سچے دل اور سچی لگن سے بڈھے باپ کی خدمت کرتے ہیں۔ گو بڈھے نے اپنی پہلے دونوں بیٹوں کو بیدخل کر دیا تھا، پھر بھی گھر پر اس کا پورا پورا کنٹرول تھا۔ تمام نزدیکی کاغذات، ہنڈیاں، تمسکات، زیور اور نقد روپیہ وہ ایک تجوری میں بند کر کے رکھتا تھا تجوری

بڈھے کے کمرے میں رہتی تھی اور چابیاں بڈھے کے تکیہ کے نیچے اور بڈھا اس قدر شکی مزاج تھا کہ اگر اس کا بیٹا بھی کبھی بند تجوری کی طرف دیکھ لیتا تو بڈھے کی آنکھوں میں شک و شبہے کا طوفان اٹھنے لگتا اور اس کی سانس کی آمد و رفت تیز ہو جاتی۔

اپنی علالت کے دوران میں بڈھا آہستہ آہستہ کمزور ہوتا گیا۔ پہلے وہ بستر سے اُٹھ سکتا تھا اور دروازہ بند کر کے اور اپنے بیٹے اور بہو کو باہر نکال کے تجوری کھولتا تھا اور تجوری کے اندر دولت کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب بستر سے اُٹھنا بھی اس کے لئے ممکن نہ رہا۔

اس دن کے بعد سے تجوری کبھی نہ کھلی۔ بڈھے نے یوں تو کبھی کچھ نہ کہا۔ لیکن بڈھے کی نکھوں کی حریص چمک کہے دیتی تھی کہ تجوری کی طرف کوئی جائے بھی نہیں۔ بہو نے غالباً اس کا خیال بھانپ لیا تھا۔ اسی لئے اس نے اور بیٹے نے تجوری کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی بھار شاید چور نگاہوں سے وہ اس تجوری کو ..... دیکھ لیتے ہوں گے۔ جس کے اندر ان کا مستقبل بند تھا۔ لیکن صاف کھلے انداز سے اسے دیکھنے کی جرأت انہیں کبھی نہ ہوئی۔ چند رکا نت ہستہ تو بڈھے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا تھا اور بڈھے کے پاس بیٹھ کر اس کے پاؤں دابنے لگتا اور بڈھا ہولے ہولے کھانسنے لگتا۔ لیکن بڈھا کچھ بھی کرتا اس کی بے بس ر مجبور نگاہیں تجوری ہی کی طرف چلی جاتیں اور پھر وہیں جم جاتیں۔ پہروں، گھنٹوں وہ اپنی تجوری طرف دیکھا کرتا جس میں اُس کی زندگی کا اثاثہ بند تھا۔

گو اب وہ اس میں ہاتھ تو نہ لگا سکتا تھا اور نہ اسے کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اسے بات کا بھروسا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے نہ تجوری کھلے گی، نہ اس کی زندگی میں اس کی لی پر کوئی ہاتھ صاف کر سکے گا۔

دھیرے دھیرے بڈھا کمزور ہوتا گیا۔ دھیرے دھیرے تجوری پر گرد و غبار کی تہیں چڑھتی ۔ اور وہ منحوس، بدصورت، زنگ آلود تجوری ایک سنگین قبر کی طرح تاریک نظر آنے لگی۔ مکڑی

نے اس پر ایک بڑا جالا بنا لیا تھا۔ اور خود بڈھا اپنے میلے بستر پر پڑا ہوا خفیف آواز میں کراہتا رہتا تھا لیکن چندر کانت مہتہ اپنے بڈھے باپ کی خصلت سے واقف تھا اس نے کبھی بھول کر بھی ایک بار بھی اپنے بڈھے باپ سے روپے نہیں مانگے۔ خود دن رات محنت کی، قرض لیا ادھر ادھر سے مانگ مانگ کر اپنے دن کاٹے لیکن تجوری کو کھولنے کی استدعا کبھی نہ کی اسے معلوم تھا کہ یہ استدعا اس کا وقار اس کے باپ کی نظروں میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گی۔ اس کے دونوں بھائی جائیداد سے بے دخل ہو چکے تھے اب تو یہ ساری کی ساری دولت صرف اسی کے حصے میں آنے والی تھی۔ صرف بڈھے کے مرنے کا انتظار تھا لیکن چندر کانت نے کبھی بڈھے پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کس شدت سے کس سچائی سے کس لگن سے وہ بڈھے کی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ بظاہر وہ ہر لحظہ بڈھے کے سامنے اور اپنے دوستوں کے سامنے بڈھے کی صحت کی دعائیں مانگا کرتا، اسی شدت سے اس کے دل میں بڈھے کی موت کی آرزو اپنے پاؤں پھیلائے جاتی۔ کبھی کبھی تو شدتِ انتظار سے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے اور وہ نگاہیں جھکا لیتا کہ ایسا نہ ہو کہیں دل کے اندر چھپا ہوا جذبہ آنکھوں کے چور دروازے سے جھلک کر باہر آ جائے۔ کبھی کبھی تو وفورِ جذبات سے اس کا دل گھبرانے لگتا۔ ایک مکڑی بستر پر ہے، ایک تجوری پر ہے۔ کیوں نہیں وہ ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے ان جالوں کو توڑ کر اس دولت پر قبضہ کر لیتا جو اخلاقی اعتبار سے اب اس کی ہو چکی ہے۔

مگر نہیں ٹھیر، اے دل بیتاب ٹھیر! اگر پھل خود ہی پک کر اس کی جھولی میں گرنے والا ہو تو درخت پر چڑھ کر شاخوں سے الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کیا اس کے دل میں ارمان تھے وہ ان نئے پرانے مکانوں کی دلالی سے عاجز آچکا تھا۔ وہ سٹے کے داؤ پر ایک ہی بار بیس ہزار لگا کر لاکھوں کمانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مجہول باپ اب تک زندہ تھا اور زندہ چلا آرہا تھا۔ ایک ہی سانس تھی جو نگاہیں اٹکی تھی

لیکن کسی طرح یہ سانس باہر نہیں نکلتی تھی کبھی کبھی یہ سانس خود اسے اپنے گلے میں پھانسی کی رسّی کی طرح چبھتی معلوم ہوتی تھی۔ بیٹے کی خدمت میں اس کے انہماک میں ایک اس طرح کا جذبہ بلکہ مسکہ شامل تھا۔ جیسے اس کی روح کا ذرہ ذرہ پچاس سالہ باپ کی ضد کے خلاف احتجاج کر رہا ہو کیوں نہیں مر جاتے تم، میرے باپ، کیوں نہیں تم اس جسم کا مکان خالی کر دیتے؟ کرائے دار آتے ہیں کرائے دار جاتے ہیں۔ لیکن تم اپنا فلیٹ کیوں نہیں خالی کرتے؟ پچاس سال ہو گئے تمہیں اس جسم میں رہتے ہوئے اب جاؤ تاکہ میں دلالی کر سکوں اور نیا بزنس کھول سکوں،

مگر بڈھے کو معلوم تھا کہ جسم ایک ایسا فلیٹ ہے جو ایک بار خالی کر دینے پر کبھی لیا نہیں جا سکتا۔ اس لئے وہ گزرتے ہوئے وقت کی طرح رینگتے ہوئے بھی وقت کے ایک ایک پل سے لڑائی کر رہا تھا اور اپنی زندگی پر جھپٹ رہا تھا۔ اس کی گرسنہ نگاہوں میں زندہ رہنے کی ایسی چاہ تھی کہ موت بھی اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتی تھی پھر وہ دن آ گیا جب بڈھا بیحد کمزور ہو گیا۔ اس کے کان بہرے ہو گئے۔ اس کی زبان بند ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے، نبض جواب دے گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا:

"بڈھا اب چند لمحوں کا مہمان ہے"۔

فرمانبردار بیٹے نے وفورِ غم سے اپنے آنسو پونچھے اور پہلی بار بند کوٹھری کی طرف جرأت آزما نگاہوں سے دیکھا۔

اور جس وقت بیٹے نے کوٹھری کی طرف دیکھا اسی وقت باپ نے بیٹے کی طرف دیکھا اور بیٹے کی وہ نگاہ ایک تیر کی طرح باپ کے سینے میں گھستی چلی گئی اور یکایک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے باپ کی طرف محسوس کی جانے والی محبت کا رنگ روغن نوچ لیا ہو۔ بیٹے کے ننگے جذبات کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ بڈھے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری اٹھی اور اس کی بے بس مجبور آنکھوں کی حریصانہ چمک غم و غصے کے شعلے میں تڑپنے لگی

اب جسم خاکی کے کسی کونے میں شاید کہیں جان باقی نہ تھی صرف ماتھا گرم تھا اور سانس چل رہی تھی اور وہ بھی رک رک کر چل رہی تھی۔ صرف آنکھیں روشن تھیں اور ان میں ایک معمولی چمک تھی جو ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی جیسے لو ختم ہونے سے پہلے ایک بار بلند ہو جائے۔

بیٹے نے باپ کی نگاہ نہیں دیکھی ورنہ وہ گھبرا جاتا! اس وقت وہ اپنے دوستوں کے گروہ میں کھڑا اس کمرے میں آہستہ آہستہ کسی سے چندن لانے کے لئے کہہ رہا تھا کسی سے پنڈت بلانے کے لئے کسی کو گھی کا آرڈر دے رہا تھا۔ کسی کو نئے کفن کا اور کسی کو چتا کی لکڑیوں کا!

دھیرے دھیرے انتہائی رازدارانہ لہجے میں وہ اپنے دوستوں سے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان اس طرح بات کر رہا تھا جیسے اس کا باپ مردہ ہو اور آج سے وہ اس گھر کا مالک ہو۔ اس کے بولنے کے لہجے میں اور چلنے کے انداز میں غیر شعوری طور ایک خاص جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔

سب دوست آجا رہے تھے۔ عورتیں رونے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ بہو کو دلاسے دے رہی تھیں۔ لوگ مختلف گروپوں میں بنگلے کے اندر اور باہر کھڑے مختلف باتیں کر رہے تھے اور بڈھے کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جس میں اب ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق چند لمحوں کی دیر تھی۔

وہ چند لمحے، چند منٹ بھی گزر گئے۔ چند منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ بڈھا اسی حالت میں لیٹا تھا۔ اسی طرح اس کی سانس چل رہی تھی۔ نبض واپس نہ آئی تھی لیکن آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی تھی۔

ایک بار جو بڈھے نے تجوری سے نظر ہٹا کر شعلہ بار نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا تو بیٹا یکایک گھبرا گیا۔ یکایک اسے معلوم ہوا کہ جس راز کو اس نے اتنے سال سے اپنے باپ کی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا۔ وہ آج ایک ہی نگاہ میں افشا ہو گیا ہے اب دونوں

نگاہیں ایک دوسرے پر تھیں، باپ کی بیٹے پر، بیٹے کی باپ پر، دونوں دشمن آمنے سامنے کھڑے تھے۔ بیچ میں دولت تھی۔

جب صبح کے پانچ بج گئے تو ڈاکٹر کو بڈھے کی نبض واپس آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ سب لوگوں نے بیٹے اور بہو کو مبارک باد دی، ہمارے رات بھر کے جاگے ہوئے تھے سب لوگ اپنے اپنے گھر جا کر سو گئے۔

صبح نو بجے کے قریب بڈھے کے بنگلے سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوئیں اور لوگ گھبرا کر نہیں بلکہ اطمینان سے اپنے اپنے گھروں سے نکلے سب کے چہروں پر ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ آخر وہ گھڑی آ پہنچی جس کا سب کو انتظار تھا۔ ہم سب لوگ بھاگے بھاگے بنگلے کے دروازے تک پہنچے اور ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کیا بڈھا مر گیا؟"

بنگلے کے پٹھان دربان نے سر ہلا کر کہا "نہیں جناب! بڈھا تو زندہ ہے۔ اس کا بیٹا مر گیا! ابھی ابھی اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

آپ بھی لکھئے

ادب اکادمی کے مقاصد سے اتفاق کرنے والے اہل قلم حضرات سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنی نگارشات ہمیں ارسال فرمائیں تاکہ ان کی اشاعت کا انتظام کیا جاسکے۔

مسودات موصول ہونے پر مستند ادیبوں پر مشتمل بورڈ ان کا جائزہ لے گا اور قابل اشاعت ہونے کی صورت میں اکادمی انہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کرے گی۔ مسودات بھیجتے وقت اپنے پاس ایک نقل ضرور رکھ لیجئے تاکہ کسی وجہ سے گم یا ضائع ہوجانے کی صورت میں کوئی شکایت باقی نہ رہے۔ ہر مسودے کے ساتھ **ادب اکادمی** کے نام مبلغ ۱۰/- روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ بطور داخلہ فیس (ناقابل واپسی) آنا ضروری ہے۔

بورڈ کی طرف سے منظور کئے جانے کی صورت میں اشاعت کے سارے اخراجات اکادمی برداشت کرے گی۔

تمام مسودات "ادب اکادمی پوسٹ بکس نمبر ۲۵۱۰، کراچی۔ ۱۸" کے پتہ بھیجے جانے چاہئیں۔

چور کا بھائی

کئی دنوں سے میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے اس کی کھولی بھی دیکھ لی تھی جو مارول کے مضافاتی علاقے میں اس سنسان سڑک پر تھی جو آرے کالونی کو جاتی ہے یہ سب سے آخر میں واقع تھی۔ وہ چگی داڑھی والا ادھیڑ عمر کا آدمی بالکل اکیلا رہتا تھا اور جس کا جسم بھی انتہائی دبلا پتلا سوکھا اور چمرخ تھا اور جب ہاتھ میں ایک بیگ لے کر باہر نکلتا تو اپنی بھوری مٹیالی اچکن میں غلطاں اس طرح غنودگی کے عالم میں لڑکھڑاتا ہوا گزرتا جیسے موسم سرما کا کھیا ہوا مینڈک چھ ماہ بعد نیند سے بیدار ہو کر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس چگی داڑھی والے آدمی کا معمول تھا کہ وہ دن بھر اپنی کھولی میں بند رہتا، سہ پہر کے قریب باہر نکلتا، نہایت احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتا اور اپنی کھولی کا دروازہ باہر سے بند کرتا اور پھر دبے پاؤں وہاں سے رخصت ہو کر سڑک پہ چلنے کے بجائے مکانوں کے پیچھے سے گزرتا ہوا حلوائی کی دکان پر پہنچتا وہاں سے دو آنے کی بھجیا لے کر کھاتا، کبھی اس کے ساتھ ایک پیالی چائے بھی پی لیتا، ورنہ پانی کے دو گلاس چڑھا لیتا پھر نہایت احتیاط سے اپنا چرمی بیگ ذرا سا کھول کر اِدھر اُدھر گھبرا کر دیکھتا اور پھر بیگ سے دو آنے نکال کر حلوائی کو دیتا اور جلدی سے بیگ بند کر کے وہاں سے چلا جاتا اور بمبئی جانے والی بس میں سوار ہو کر مارول سے چلا جاتا اور کافی رات گئے دس گیارہ بجے پلٹتا۔ یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔

مجھے اس آدمی کی نقل و حرکت میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کون تھا؟ کیا کرتا تھا؟ میں نے اس کے ہمسایوں اور گرد و نواح کے رہنے والوں سے جو بیشتر دودھ بیچنے والے گوالے تھے دریافت کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر کسی کو کچھ پتہ نہ چل سکا۔ دراصل کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ اس امر نے چگی داڑھی والے مرد کی شخصیت اور بھی پُراسرار بنا دی تھی اور دودھ

بیچنے والے اپنی بھینسوں کی دیکھ بھال میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ انھیں اس شخص کے حالات کریدنے کی فرصت ہی کہاں؟ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دن بھر اپنی کھولی میں بند ہو کر جعلی نوٹ بناتا ہے، کچھ لوگ اسے پیشہ ور عورتوں کا دلال سمجھتے تھے ورنہ شام ہی کو وہ بمبئی کیوں چلا جاتا ہے اور رات گئے دیر سے کیوں واپس آتا ہے؟ کچھ لوگ اس کا بھاری بھرکم چرمی بیگ دیکھ کر اندازہ لگاتے تھے کہ وہ ناجائز طور پر ٹھرے کی بوتلوں کی برآمد کا کام کرتا ہے، غرض جتنے منھ اتنی باتیں، لیکن کسی کو اس کے کام کا کچھ پتہ نہ تھا لیکن ہر شخص کو اس کے بیگ سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس بیگ میں کیا ہے؟ یہ ہر شخص جاننا چاہتا ہے مگر کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کیونکہ چگی داڑھی والا آدمی ہر وقت بیگ سینے سے لگائے رکھتا تھا۔ ایک دفعہ حلوائی کے لونڈے نے بیگ کو ہولے سے ہاتھ لگایا تھا تو چگی داڑھی والے نے ایسی خشمگیں نگاہوں سے دیکھا تھا کہ بے چارہ آٹھ سال کا لونڈا وہیں سہم کر رہ گیا تھا۔

مجھے خود بھی اس بیگ میں بڑی دلچسپی تھی اور چگی داڑھی والے آدمی کی غیر حاضری میں کئی بار اس کے کمرے میں چوری کی نیت سے داخل ہو کر دیکھ چکا تھا مگر اس کی کھولی میں مجھے کوئی ایسی شے نہیں ملی جسے چرا سکتا۔ ایک پرانی وضع کا بدنما اسٹوو تھا۔ چائے کی دو ٹوٹی پیالیاں تھیں، کلونج کے مارے ہوئے چار ایلومونیم کے برتن تھے، ایک بوسیدہ چٹائی تھی، ملٹری کا ایک ڈسک تھا جس کا تالا ہمیشہ کھلا رہتا تھا اس ڈیسک کے اندر ایک قلمدان تھا، دو تین طرح کی سیاہی کی شیشیاں تھیں، نیلے رنگ کی ڈبیا میں مرہم نما کوئی چیز تھی، سفید کاغذوں کے علاوہ دو تین قسم کے رنگ دار کاغذ تھے اور کھولی کے ایک کونے میں لوہے کے چند پترے تھے اور دو لوہے کے بڑے بڑے بیلن تھے۔

ہو نہ ہو یہ آدمی جعلی نوٹ بناتا ہے یا سونا اسمگل کرتا ہے مگر کس قدر ہوشیار آدمی ہے، کام کی ایک چیز بھی کھولی میں نہیں چھوڑتا۔ آج کل چوری کرنا کس قدر مشکل پیشہ ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ گھر میں کوئی چیز رکھتے ہی نہیں۔ عورتیں کانوں کے نقلی آویزے تک تو بینک کے لاکر میں ڈال دیتی ہیں، اب اس ہوشیار زمانے میں غریب چور بھوکا نہ مرے تو کیا کرے، میں نے سوچا۔

یوں تو میں چور نہیں تھا اور چوری کرنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر حالات نے مجھے مجبور کر دیا تھا، مسلسل فاقوں نے میری شرافت کی آخری تہہ بھی دل سے کھرچ کھرچ کر صاف کر دی تھی تب جا کے میں نے مجبور ہو کر چوری کی ٹھانی مگر میں خود اس قدر دبلا پتلا اور دھان پان آدمی تھا کہ چوری کرنے سے بھی ڈرتا تھا، بہت بھوکا رہنے کے بعد میں نے چگی داڑھی والے آدمی کی کھولی میں چوری کرنے کی ٹھانی، چگی داڑھی والا مجھے اپنے سے بھی کمزور، بزدل اور عمر کا بھی بڈھا دکھائی دیتا تھا۔ اگر چوری کرتے وقت چگی داڑھی والے نے کسی طرح مجھے پکڑ بھی لیا تو میں بھی اس سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے علاوہ مجھے اس کے بیگ سے بھی بڑی دلچسپی تھی کیونکہ چگی داڑھی والا ماروں کے علاقے میں بیحد کنجوس مشہور تھا اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ اپنی تمام دولت اپنے بیگ میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے، اگر کسی طرح وہ بیگ ہاتھ آجائے؟ میں نے سوچا مگر اس کے لئے مجھے رات میں اس وقت کھولی میں جانا پڑے گا جب کہ وہ چگی داڑھی والا آدمی سو رہا ہو اور چونکہ یہ میری پہلی چوری تھی اس لئے ہمت نہ ہوتی تھی مگر آخر ایک رات کئی دن کے مسلسل فاقے کے بعد میں نے اپنے آپ کو اس خطرے کے لئے بھی تیار کر ہی لیا۔ اب جو ہو سو ہو! اپنی طرف سے تو میں نے ہر ممکن احتیاط برت لی ہے، آدمی کمزور اور ادھیڑ عمر کا ہے اور اکیلا رہتا ہے اور اس کی کھولی سنسان جگہ پر واقع ہے، اس کی کھولی کے آگے ایک وسیع باغ ہے جس کے درختوں کے سائے میں، میں بھاگ کر گم ہو سکتا ہوں، اس باغ کے آگے لکڑی کے جنگلے سے گھرا ہوا ایک بنگلہ ہے جو اکثر خالی رہتا ہے۔ چوری کے لئے اس سے بہتر جگہوں کا ملنا ناممکن ہے۔

چنانچہ ایک رات میں آم کے ایک پیڑ کے نیچے تاریک سایوں میں دیر تک کھولی پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ کھولی کا تالا باہر سے بند تھا رات کے دس بجے کے قریب وہ چگی داڑھی والا آدمی کچھ گنگناتا ہوا برامدے میں داخل ہوا، دونوں ہونٹ پھیلا کر اس نے پان کی پیک آم کے پیڑ کی طرف پھینکی جو سیدھی میری قمیض پر آکر گری، مجھے غصہ تو بہت آیا مگر یہ وقت احتجاج کا نہ تھا، اس لئے دانت پیس کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد چگی داڑھی والا آدمی اپنی کھولی کے اندر چلا گیا اور پھر کمرے کی بتی روشن ہوئی۔ آدھ گھنٹے تک بتی روشن رہی پھر میں نے دیکھا کہ بتی بجھ گئی ہے پھر بھی میں تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک جامد و ساکت اپنی

جگہ پیڑ کے نیچے کھڑا رہا۔ جب دور کسی گھڑیال نے بارہ بجائے تو میں آم کے پیڑ کی تاریکی سے نکل کر برآمدے میں آیا اور دبے پاؤں چل کر کھولی کے دروازے تک پہنچا۔ میری سانس زور زور سے چل رہی تھی، دروازے پر پہنچ کر میں نے پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھا اور اپنی سانس قابو میں کی اور کھولی کے اندر کی ڈھیلی کنڈی کھولنے کے لئے دروازوں کے دونوں پٹوں کے درمیان کی خالی جگہ میں اپنی دو انگلیاں داخل کیں مگر میرے ہاتھ میں کنڈی کی زنجیر نہ آئی اور تھوڑی دیر بعد مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ چگی داڑھی والے نے کنڈی اندر سے نہ لگائی تھی۔ دروازہ خود بخود ذرا سا زور لگانے سے کھل گیا۔ اب میرے سامنے کھولی کا ادھ کھلا دروازہ تھا اور کمرے میں تاریکی تھی۔ یکایک مجھے باہر کی دنیا سے ڈر محسوس ہونے لگا اور میں گھبرا کر کھولی کے اندر داخل ہوگیا۔

کمرے کے اندر گھپ اندھیرا تھا، میں آہستہ سے دوزانو ہوگیا اور جانوروں کی طرح پنجوں کے بل چلتا ہوا اپنی دانست میں اِدھر اُدھر جانے لگا جہاں ہر روز چٹائی بچھی رہتی تھی، اس کی سمت مجھے اچھی طرح یاد تھی میں آہستہ آہستہ چل کر اس چٹائی تک پہنچ جانا چاہتا تھا، اس بیگ تک، قیمتی بیگ تک، اگر کسی طرح میں خاموشی سے اس قیمتی بیگ تک آہٹ کے بغیر پہنچ جاؤں تو پھر وہ بیگ سوتے ہوئے آدمی کے سرہانے سے نکال لینا مشکل نہ ہوگا اور پھر بھاگنا تو قطعی مشکل نہ ہوگا، باہر وسیع باغ تھا اور اس کی محفوظ تاریکی تھی اور میں ادھیڑ عمر کے آدمی سے زیادہ طاقت ور تھا اور تیز بھاگ سکتا تھا۔

میں دونوں ہاتھوں پاؤں کے بل گھسٹتا ہوا اپنی سانس روکتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ یکایک میرے پیچھے سے دروازہ ایک عجیب سی صدا پیدا کرتا ہوا دھیرے سے بند ہوگیا۔ غالباً ہوا کے جھونکے سے بند ہوا ہوگا مگر میں نے گھبرا کر پیچھے پلٹ کر دیکھنا چاہا تو کوئی بھاری بھرکم سی چیز دو تین مرتبہ میرے سر سے ٹکرائی اور میں وہیں بے ہوش ہوگیا۔

جب میں ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا کہ میں خود کھولی کی ایک دیوار سے لگا بیٹھا ہوں، چگی داڑھی والے آدمی نے میرے بازو، پیچھے کی طرف لے جا کر ایک چادر سے باندھ دیئے تھے اور اب وہ کھولی کے واحد بلب کی کمزور پیلی اور کھسیانی سی روشنی میں میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ چگی

داڑھی والا بولا ——————

"کئی روز سے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میری تاک میں ہو"

میں چپ رہا، اب کہتا بھی کیا؟ چگی داڑھی والا فاتحانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولا

"اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری غیر حاضری میں کوئی میری کھولی میں آیا تھا مگر میں بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے؟"

میں نے کہا "میں بھوکا تھا مگر مجھے تمہاری کھولی سے کچھ نہ ملا۔ ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہیں"

"ہاہاہاہا" چگی داڑھی والا بڑی بے رحمی سے ہنسا "چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں ..... ؟"

"کیا تم چیل ہو؟" میں نے اس سے پوچھا

"میں جو ہوں سو ہوں مگر تم بتاؤ، تم کون ہو؟"

"میرا کام ہی سے ظاہر ہے کہ میں اس وقت کہاں ہوں" میں نے کہا

چگی داڑھی والا آدمی بولا "مگر جب تمہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں اپنی کھولی میں کچھ نہیں رکھتا تو پھر تم نے چوری کی کوشش کیوں کی؟"

"تمہارا بیگ" میں نے آنکھوں کی جنبش سے اس کے چرمی بیگ کی طرف اشارہ کیا

"مجھے اس بیگ سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، میں جاننا چاہتا تھا کہ اس بیگ میں کیا ہے"

"اس بیگ کے اندر میری ساری زندگی کی دولت جمع ہے" چگی داڑھی والے نے ایسی شدت سے کہا کہ مجھے اس کی صداقت کا کامل یقین ہو گیا۔

میں نے اس سے کہا "اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو میں چوری کرنے کبھی نہ آتا"

"کیا تم دیکھنا چاہو گے کہ اس بیگ کے اندر کیا ہے؟"

"ضرور"

چگی داڑھی والا ہچکچایا۔ بولا "صورت شکل سے تم شریف آدمی معلوم ہوتے ہو!"

میں نے ملتجیانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "یہ میری پہلی چوری ہے"

چگی داڑھی والے کا دل پسیج گیا، بولا "میں تمہیں پولیس کے حوالے کر بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی کر سکتا ہوں مگر یہ سب تم پر منحصر ہے"

"میں وعدہ کرتا ہوں، میں بھوکا مر جاؤں گا مگر اب کبھی چوری نہیں کروں گا" میں نے گڑگڑا کر اس سے کہا "مجھے پولیس کے حوالے مت کرو"

"صرف وعدہ کافی نہیں ہے"

میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "میں اسٹامپ پیپر پر معافی نامہ لکھنے کو تیار ہوں"

"اوں ہوں!" چگی داڑھی والے نے انکار میں سر ہلایا "معافی مانگنے سے کام نہیں چلے گا، تمہیں اس کے لئے جو کچھ میں کہوں اسے غور سے سننا ہوگا"

فرمائیے! فرمائیے!" میں نے انتہائی اشتیاق سے سر آگے جھکا کر کہا

"میں آپ کی نصیحت سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوں"

چگی داڑھی والے نے مسکرا کر اپنا چرمی بیگ کھولا اور بولا "میں کئی دن سے اس لمحے کی تاک میں تھا کہ تم اندر گھسو تو....." اس نے فقرہ ناتمام رہنے دیا اور اب اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں، اس نے جلدی سے بیگ کھول کر اس سے کاغذوں کا ایک بہت بڑا پشتارا باہر نکالا اور اسے اپنے زانو پر رکھ لیا۔

میں نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

وہ بولا "یہ میرا تازہ کلام ہے"

"تم شاعر ہو؟" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا

چگی داڑھی والے نے آداب بجالاتے ہوئے کہا "خاکسار کو رضا علی راز کہتے ہیں، میں

نے آٹھ ہزار چھ سو اشعار کی ایک غزل مسلسل لکھی ہے اور یہ میرا تازہ ترین کلام ہے اور اب تمہیں میرا کلام سُننا ہوگا۔"

نہیں .... نہیں .... " میں نے دونوں آنکھیں بند کر کے کہا

"مجھے حوالات بھیج دو! مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔"

راز میری بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے بولا " چھیاسی سو اشعار کی غزل میں کل چھیاسی قافیے ہیں اور میں نے ہر قافیہ ایک سو مرتبہ استعمال کیا ہے اور ہر بار نئے ڈھنگ سے لایا ہوں، اس غزل میں آپ کو حیدر آباد کا لوچ، دہلی کا روزمرہ اور لکھنؤ کا چٹخارہ سب مل جائے گا میں دو ماہ سے یہ غزل بیگ میں لئے گھوم رہا ہوں مگر کوئی خدا کا بندہ اسے سُننے کو تیار نہیں۔"

"پولیس! پولیس!" میں نے چلا کر کہا

" خاموش بدزبان!" راز نے گرج کر کہا " تو نہیں جانتا کہ تیرے کان آج جس نغمے سے آشنا ہوں گے، وہ میری زندگی کا شاہکار ہے، ایک زمانہ آئے گا جب غالب کے کلام کی طرح میرے کلام کی بھی پرستش ہوگی، تجھے خداوند عزّ و جل کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ آج آدھی رات کی تنہائی میں تجھے وہ سعادت نصیب ہو رہی ہے جس کے لئے آنے والی نسلیں ترسیں گی۔"

" مجھ پر بھی ترس کرو! رحم کھاؤ! میں ایک غریب چور ہوں میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے جس کی تم مجھے ایسی سخت سزا دے رہے ہو؟"

میں نے انتہائی لجاجت سے گڑگڑا کر اس سے کہا مگر وہ مردود بالکل نہ مانا۔

اس نے اپنی بیاض کھول کر اپنے دونوں بازوؤں پر رکھ لی اور میری طرف دیکھ کر بولا:

" حضراتِ باتمکین! اب شمع محفل، اُستاد کامل، فاضلِ اجل جناب رضا علی راز آپ کے سامنے آئی ہے، ان کا کلام سنیے اور سر دُھنیئے۔"

میں نے اپنا سر دیوار سے دے مارا مگر چکی داڑھی والے پر ذرا بھی اس کا اثر نہ ہوا اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے آداب عرض کیا اور کہا " مطلع عرض ہے "

میں نے بہت چیخ پکار کی، آہ وزاری سے کام لیا، دیوار سے بار بار سر دے مارا مگر اس ظالم کا دل نہ پسیجا اور وہ برابر مجھے اپنی غزل مسلسل دو گھنٹے تک سناتا رہا اور ہر شعر پر داد وصول کرتا رہا۔ دو گھنٹے بعد میں نے اس سے انتہائی ملتجیانہ آواز میں کہا " خدا کے لئے مجھے تھوڑا سا پانی دے دیجئے ! "

آواز خوش ہو کر بولا " تو غزل آپ کو پسند آئی ؟ اجی حضرت میں نے اس غزل مسلسل کے لئے مسلسل فاقے کئے ہیں، کبھی کھانا مل گیا تو کھا لیا، ورنہ باسی ڈبل روٹی کے ٹکڑے ہی پر اکتفا کیا، کیا بتاؤں اس غزل کی خاطر میں نے اپنی جانِ عزیز شمع کی طرح گھلائی ہے "

" بے شک، بے شک " میں نے عاجزی سے کہا " آپ کا چہرہ دیکھ کر ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ڈبل روٹی کے ٹکڑے کے بجائے موم بتی کے ٹکڑے کھا کر شعر کہتے رہے ہیں "

" واللہ آپ بے حد قدر شناس معلوم ہوتے ہیں، میں نے آپ کو پہچاننے میں سخت غلطی کی " رضا علی آواز پشیمان ہو کر بولے " میں نے آپ کو محض ایک چور سمجھا، حالانکہ آپ تو خاصے خوش ذوق انسان ہیں، لائیے میں آپ کے ہاتھ کھول دیتا ہوں اور اس بدسلوکی کے لئے معافی مانگتا ہوں۔ اب آپ آرام سے بیٹھئے، میں آپ کے لئے باہر نل سے پانی لے کر آتا ہوں۔ آپ اطمینان سے پانی پی کر غزل سنیئے۔ اب تو صرف تین ہزار نو سو شعر رہ گئے ہیں "

یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ کھول دیئے اور لوٹا لے کر برآمدے سے باہر نل سے پانی لانے کے لئے چلا گیا۔ میں اتنے میں جلدی سے اٹھ کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا اور جب وہ پانی لے کر لوٹا تو میں نے عقب سے جست کر کے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر میں اس سے ذرا تگڑا تھا میں نے اپنے دونوں بازوؤں سے اسے قابو کر لیا۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ پاؤں اسی چادر سے باندھ دیئے جس سے اس نے میرے باندھے تھے اور اسے وہیں بٹھا

جہاں اس نے مجھے بٹھایا تھا۔

پھر میں نے اس کے قلمی بیاض تہہ کر کے اس کے چرمی بیگ میں ڈال دی وہ سمجھا شاید میں اس کا کلام چرا کر لے جا رہا ہوں وہ زور زور سے چلانے لگا۔ "اے ظالم! یہ تو میری زندگی بھر کی کمائی ہے اسے مت لے میں تیری منت کرتا ہوں، خدا کے لئے یہ ظلم مجھ پر نہ توڑ۔"

میں نے کہا "باولے ہوئے ہو؟ کون تمہارا کلام چوری کر کے لے جائے گا۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کا بیگ انتہائی نفرت سے دیوار پر دے مارا اور غضبناک لہجے میں اس سے کہا "کم بخت تو سمجھتا ہے، میں تیرے جیسے بھوکے افلاس و نکبت کے مارے ہوئے شاعر کے اں چوری کرنے آیا تھا یا تیرا اسٹرا ہوا کلام سننے آیا تھا جس سے باسی پکوڑیوں کی بُو آتی ہے؟"

"پھر تم کیوں آئے تھے؟" رضا علی رازؔ نے حیران ہو کر پوچھا۔

جواب میں، میں نے اپنے تہمد میں ہاتھ ڈالا اور رضا علی رازؔ کی بیاض سے بھی بڑا ایک پشتارا باہر نکالا۔ "یہ کیا ہے؟" رازؔ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ ایک ناول ہے۔" میں نے فخریہ لہجے میں اور بے حد فاتحانہ انداز میں اس سے کہا "یہ سترہ سو صفحے کا ناول ہے جسے میں نے ایک ہفتے میں ختم کیا ہے!"

رضا علی کی گھگھی بندھ گئی، وہ میری طرف پھٹی پھٹی دہشت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا "کیا تم .... کیا تم .... کرشن چندر ہو؟"

"نہیں، میں نئی نسل کا ادیب ہوں!" میں نے گرج کر اس سے کہا "میرا نام ہے جونت رائے پروانہ! میں ہندو ادب کی تخلیق کرتا ہوں!"

"ہندو ادب؟" رضا علی رازؔ نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" میں نے چڑ کر اس سے کہا "اگر اسلامی ادب تخلیق ہو سکتا ہے تو ہندو ادب کیوں تخلیق نہیں کیا جا سکتا؟ اس ناول کا نام ہے "دھرت راشٹر کی واپسی! اپنے قدیم کلچر سے بے بہرا انسان! میں نے اس ناول میں

اپنا رشتہ ماضی سے جوڑا ہے، حال اور مستقبل سے اپنا ناتا توڑا ہے"

رضا علی نے دانت پیس کر کہا۔ " میرا جی چاہتا ہے، تمہارا سر توڑ کر تمہارا رشتہ ہمیشہ کے لئے ماضی سے جوڑ دوں"۔

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا " اس بے مثل شاہکار کے تین ہیں، پہلا حصّہ دریا کی آگ، دوسرا حصّہ بستی کے خدا، تیسرا حصّہ کلیوں کا طوفان!"

" دریا کی آگ؟ بستی کے خدا؟ کلیوں کا طوفان؟" رضا علی راز نے کہا "یہ نام بڑے مانوس معلوم ہوتے ہیں، آگ کا دریا تو قرۃ العین حیدر کا ناول اور خدا کی بستی شوکت صدیقی کا ناول ہے، اور طوفان اور کلیاں کرشن چندر کا ناول۔

" ہاں! میں نے اپنے ماضی سے استفادہ کیا ہے صرف نام اُلٹ دیئے ہیں"۔

"اُسے تم استفادہ کہتے ہو؟" رضا علی راز شکایتاً کہنے لگا۔

"خاموش بد زبان! اب جگر تھام کے بیٹھ! اور سن میرا ناول شروع ہوتا ہے"

" آفتاب کا سرمئی چہرہ سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا اور سمسانی ہوا کا سونکا آ کے مدقوق کرنوں کے سیاہ فام اجالے کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے ...."

" میرے دماغ کی دھجیاں مت بکھیرو!" رضا علی راز چیخ کر بولا "خدا کے پر رحم کرو.... آفتاب کا سرمئی چہرہ؟ .... سمسانی ہوئی ہوا کا سونکا؟ سیاہ فام جو منتا رائے پروانہ! تجھے تیرے بھگوان کا واسطہ...."

مگر میں نے اپنا ناول جاری رکھتے ہوئے کہا "یکایک مہابھارت کے مہاراج راشٹر نے کہا، دھنت تیری کی سبجے! مجھے مہابھارت کا میدانِ جنگ عجیب سا نظر آ رہا ہے۔ یدھشٹر کہاں گیا؟ ارجن کو کیا ہوا؟ یہ لوہے کے رتھ کیوں چل رہے ہیں؟"

" سنجے نے جواب دیا، مہاراج ادھیراج کہ جن کا بول بالا گاندھارے سے گر ہے اور کپل دستو سے کالا شاہ تک ہے، ایسے چکرورتی مہاراج کو معلوم ہو کہ جو آپ

، وہ لوہے کا رتھ نہیں ہے، وہ ٹینک ہیں، یہ مہابھارت کا میدانِ جنگ نہیں ہے، دوسری
ے فرائیڈ ہے جس کے اڈی پس کامپلکس سے مجبور ہو کر پردست نے اپنے لکھنے کا کمرہ تین ماہ
لئے بند کر لیا تھا تاکہ خارجی ایشیا کے نفوذ سے باطنی اظہار کا جمود ٹوٹنے نہ پائے۔"

" ہائیں! ہائیں!" رضا علی چلا کر بولا " یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میری تو سمجھ
کچھ بھی نہیں آتا۔"

" احمق اعلےٰ ادب وہی ہوتا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے، یہ وہ تمہارا پرانا دقیانوسی
نہیں ہے جو ہر کسی کی سمجھ میں آجاتا ہے اسے سمجھنے کے لئے ذہانی لگن کے ساتھ اگر روح میں
ن جوہر کے عناصر خمسہ اپنے دخلی انتشار کی سراسیمگی سے متاثر ہو کر دیدۂ گریاں سے چھلک
ں تو کائنات کا کلیجا شق ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے۔"

"مجھے قتل کر دو، میرے سر پر آہنی بیلن دے مارو، مجھے میرے کیفر کردار تک
پہنچا دو مگر مجھے یہ ناول مت سناؤ خدا کے لئے ...." رضا علی آواز بچوں کی طرح سسک
سسک کر رونے لگا۔

مجھے اس پر ترس تو بہت آیا لیکن اب میں نے ناول لکھ لیا تھا، کیسے نہ اسے سناتا اور
نہ سناتا تو پھر کیسے سناتا؟ ناچار میں اسے سناتا ہی رہا اور ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ بے حد نرمی
ے بولا : "پروانہ بھائی تمہارا ناول بے حد عمدہ ہے، خدا کی قسم اب مزہ آرہا ہے، اگر
وقت کہیں سے چائے کی ایک پیالی مل جاتی؟"

" تمہارے گھر میں تو چائے کی ایک پتی تک نہیں ہے، نہ میرے گھر میں ہے، ہم
ں ادیب ہیں یہ مت بھولو۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

" ایک کام کریں۔" رضا بولا

" کہو!"

" یہاں سے اُٹھ کر ہم ساتھ والے بنگلے چلیں۔"

" مگر وہ بنگلا تو کب کا خالی پڑا ہے" میں نے جواب دیا

وہ بولا " نہیں اسے عبدالحمید آرزو نے کرائے پر لیا ہے، اس کے ہاں چلیں گے، تم اسے اپنا ناول سُنانا، میں اپنا کلام سناؤں گا"

" مگر کیا وہ سُنے گا" میں نے اس سے پوچھا۔

" اجی کیوں نہیں سُنے گا؟ ابھی بہت رات باقی ہے، ہم دبے پاؤں اس کے بنگلے میں گھُس کر اس کے بیڈ روم کے اندر چلے جائیں گے اور اسے پکڑ کر پلنگ سے باندھ دیں گے پھر وہاں چائے ڈبل روٹی کا انتظام بھی ہوگا"

" کیسے ہوگا؟ آخر وہ بھی تو ایک ادیب ہے" میں نے اپنا شُبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا " یہ مت بھولو"

" نہیں، اس نے ادب کو خیرباد کہہ دیا ہے اور آج کل وہ شبیر بازار میں دلالی کرتا ہے، اس کے ہاں سب کچھ ملے گا"

" تو چلو" میں نے جلدی سے رضا علی راز کے ہاتھ پاؤں کھول کر اسے آزاد کر دیا اس نے اپنی بیاض اٹھائی، میں نے اپنا ناول اٹھایا اور پھر ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے باغ کی روشوں سے گزرتے ہوئے دھیرے دھیرے عبدالحمید آرزو کے شاندار بنگلے میں داخل ہو گئے۔

شرمیلی رُوح

پریم کمار نے پریم تو بہت سے کئے تھے لیکن شادی کسی سے نہیں کی تھی۔ ہر بار جب اُس نے کسی لڑکی سے پریم کیا سچّا پریم سمجھ کر ہی کیا۔ یہ بات الگ ہے، کہ اپنی چالیس برس کی زندگی میں اُس نے اتنی بار سچّا پریم کیا تھا کہ دوان کی گنتی بھول چکا تھا۔ یہ سچّا پریم ہر بار جھوٹا پریم ثابت ہوا۔ اس میں غلطی نہ پریم کمار کی تھی نہ لڑکی کی۔ مگر ہر بار پریم کمار کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم سے جسم تو ملے لیکن رُوح سدا پیاسی رہی۔ کچھ ایسا لگا جیسے رُوح سے رُوح نہیں ملی۔ آتما آتما کی ساتھی نہیں بن سکتی۔ کوئی اُس بھلے مانس سے پوچھے کہ جب رُوح سے رُوح نہیں ملی تو جسم سے جسم ملانے کا کیا حق تھا؟ لیکن پریم کمار ایک کامیاب ہیرو تھا، ہر سال لاکھوں روپے کماتا تھا اور کروڑوں لوگوں کے دِلوں کا دیوتا تھا۔ ایسے دیوتا سے کون پوچھے کہ اے مسٹر پریم کمار! تم جو ہر سال دس لڑکیوں سے پریم کرتے ہو، اور ہر موسم کے بدلنے پر اپنی لڑکی بدل دیتے ہو، اور لڑکی کا دِل توڑ دیتے ہو، جیسے عمدہ ڈنر کھانے کے بعد لکڑی کا خلال توڑ دیا جاتا ہے تو صاحب یہ تمہاری محبت ہے، کہ ہوس؟ مگر دیوتاؤں سے اور نیتاؤں سے اور دھن والوں سے ایسی باتیں کون پوچھ سکتا ہے۔

اس لئے چالیس سال تک پریم کمار سچّا عشق کرتا رہا اور لڑکیاں بدلتا رہا اور کامیابی کے زینے پر چڑھتا رہا اور فلموں میں کام کرتا رہا۔ سچّا عشق کرتا رہا اور عشق کرتے کرتے چالیس برس کا ہو گیا۔ لیکن کہیں اسے اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملی۔ ایسی لڑکی جس کی رُوح سے اُس کی رُوح میل کھاتی ہو۔ ہاں اُسے جسم بہت ملے، درجنوں بلکہ سینکڑوں جسم، نوجوان اور خوب صورت جسم۔ بھولی مسکراہٹوں اور الہڑ اداؤں والے جسم، من موہنے، حسین، دلکش جسم۔ اور اس کی کوئی شب جسم کے بغیر خالی نہ گئی مگر اس کی رُوح سدا پیاسی اور خالی رہی اور

وہ اپنی ساتھی کی تلاش میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا چالیس برس کا ہو گیا لیکن اُسے اپنی رُوح کا ساتھی نہ ملا۔

لوگ اسے خوش قسمت سمجھتے تھے لیکن اس کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ کتنا بدنصیب ہے۔ بینک میں تیس لاکھ رکھنے کے بعد بھی کتنا بدنصیب ہے۔ ہر روز ایک نئی لڑکی کے ساتھ سونے کے باوجود کتنا بدنصیب ہے۔ بعض لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ پریم کمار کو دیکھ کر مجھے اکثر اُس پر رحم آیا ہے اور اس پر ترس کھا کر کئی بار میں نے سوچا، کاش! پریم کمار کی بدنصیبی مجھے مل جاتی اور میری خوش نصیبی اُسے، مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ میں پریم کمار کا دوست ہوں مگر ایک دوست بھی اپنی زندگی دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ حالانکہ ایک دن میں نے اس کا ارادہ بھی کر لیا تھا اور اپنی خوش نصیبی اور اس کی بدنصیبی کا خیال کرتے ہوئے اُس سے کہہ دیا تھا "دوست! اگر تم چاہو تو میری زندگی لے سکتے ہو۔ میری بھینگی بیوی اور اس کے ساتھ بچے لے سکتے ہو۔ میری کھولی مع دو لوٹی ہوئی چارپائیوں، تیز بستر اور دو زنگ آلود ڈرم لے سکتے ہو۔ ساڑھے پانچ ہزار کا جو قرض مجھ پر واجب ہے وہ بھی لے سکتے ہو اور تھرڈ کلاس لوکل ریلوے کا پاس بھی جو میں ہر ماہ بنواتا ہوں۔ اور جس سہارے میں فٹ بورڈ پر لٹکے لٹکے باندرہ سے چرچ گیٹ تک جاتا ہوں، تم وہ بھی لے سکتے ہو، دوست! مگر مجھ سے تمہاری بدنصیبی دیکھی نہیں جاتی۔ روز رات کو وھسکی کی بوتل کھول کر تم بلک بلک کر عورت کی رُوح کے لئے روتے ہو۔ وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ تم بتاؤ میں کیا کروں؟ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تم لے سکتے ہو۔"

پریم کمار نے میری فراخدلی سے متاثر ہو کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور سسک سسک کر بولا "دوست ہو تو ایسا، تمہارا لاکھ لاکھ شکریہ۔ مگر دوست! کون کسی کی نصیب سے اپنا نصیب بدل سکتا ہے؟ جس رُوح کی سچی محبت کی مجھے تلاش ہے، وہ اگر خود سے مجھے نہیں مل سکی تو تمہارے سہارے کیا مل سکے گی؟ اور جہاں تک تمہاری عورت

کا تعلق ہے، میں اپنی بھابی کی بہت عزّت کرتا ہوں لیکن اُس بے چاری کے منہ میں دانت تو رہے نہیں، رُوح کیا رہی ہوگی؟ میں تمہارے بچّے بھی تم سے نہیں چھین سکتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے، تمہیں اپنے بچّوں سے کتنا عشق ہے۔ تمہاری کھولی بھی میں تم سے نہیں چھینوں گا۔ ورنہ تمہیں فٹ پاتھ پر رہنے سے بڑی تکلیف ہوگی اور میں اپنے کسی دوست کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارا قرضہ بھی میں نہیں لوں گا ورنہ تم اور قرضہ چڑھا لوگے اور یہ تم سے دوستی نہیں، دشمنی ہوگی۔ تمہارا تھرڈ کلاس کا پاس بھی نہ لوں گا ورنہ تم بلا ٹکٹ پکڑے جاؤ گے۔ غرضیکہ دوست! کسی طرح ہم دونوں اپنی زندگیاں نہیں بدل سکتے مگر تم زیادہ غم نہ کرو، میں اب چالیس برس کا ہو چکا ہوں۔ اب میں زیادہ دیر اپنی بدنصیبی کی صلیب اکیلے نہ اُٹھا سکوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب میں بہت جلد شادی کر لوں گا۔ یہ میں نے طے کر لیا ہے۔"

"کس سے؟"

"یہ تو میں نے طے نہیں کیا ہے۔"

"پھر بھی نظر میں تو کوئی ہوگی؟"

"فی الحال میری نظر میں دو لڑکیاں ہیں، اور دونوں میری دو مختلف فلموں میں ہیروئن کا کام کر رہی ہیں۔ اور فی الحال میں دونوں سے محبّت کر رہا ہوں۔"

"دونوں سے؟ وہ کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ کیا معلوم ان دونوں میں سے کس کی آتما میری آتما سے مِل جائے اس لئے احتیاطاً دونوں سے محبّت کر رہا ہوں۔ اور اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں زیادہ دیر تک بھٹکنا نہیں پڑے گا اور اب میری تلاش اُن دونوں لڑکیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یقیناً ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ضرور ایسی ہوگی جو میری رُوح کی ساتھی ہوگی۔"

ہولی کے دن اُس نے بہت سے فلمی ستاروں کو پالے ہل کی اپنی شان دار کوٹھی میں مدعو کیا تھا۔ دلیپ کمار، راجکپور، شمی کپور، دیو آنند، سادھنا، آشا پاریکھ، سائرہ بانو، جبیں جلیل، وحیدہ رحمان، بے راج، ڈیوڈ، کے این سنگھ، پران، اوم پرکاش، جانی واکر سبھی فلمی ستارے اُس نے بُلالئے تھے۔ کئی سال سے یہ روایت بن چکی تھی کہ ہولی کے دن سب لوگ اُس کے گھر اکٹھے ہوتے کیوں کہ اس کی کوٹھی کا سوئمنگ پول بہت شان دار تھا۔ اور زیرآب رنگا رنگ روشنیوں سے اس طرح جھلملاتا تھا کہ سوئمنگ پول کے پانی میں چھنک کے ساتوں رنگ بکھر جاتے۔ سوئمنگ پول میں اس طرح کی خفیہ ٹونٹیاں لگوائی گئی تھیں جن سے بوقتِ ضرورت طرح طرح کے رنگ دار پانی تالاب میں چھوڑے جا سکتے تھے۔ گلابی، سبز نیلے، پیلے، اجانمی رنگوں کے پانی چاروں سمتوں سے اندر کی ٹونٹیوں سے فوارے کی طرح زور سے نکل کر جب تالاب میں آکر ملتے تو رنگوں کی کہکشاں سی بن جاتی۔ ہولی کے دن اس تالاب میں سب کو نہلایا جاتا اور جو نہانے پر تیار نہیں ہوتے تھے اُنہیں زبردستی تالاب میں پھینک دیا جاتا تھا۔ پھر بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوتا۔ تالیاں بجتیں، ڈھول پیٹے جاتے اور آئی ایس جوہر، مکری اور اوم پرکاش مل کر بھنگڑا شروع کرتے جس میں ہولے ہولے سارے فلم اسٹار شامل ہو جاتے۔

آج ہولی کی تقریب میں پریم کمار نے آرتی بالا اور آراد ھنا دونوں کو بُلایا تھا۔ آجکل وہ ان دونوں سے محبت کر رہا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کرے گا۔ مگر وہ ابھی ذہنی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ کس سے شادی کرے؟

کبھی تو اسے آرتی بالا بہت پسند آتی کیوں کہ آرتی بالا بہت ہی ہنس مکھ، شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ بہت باتونی، ہر دم مذاق کرنے والی اور خوش رہنے والی اور چھیڑ چھاڑ کرنے والی۔ وہ کبھی خاموش نہیں بیٹھتی تھی۔ اگر شوٹنگ نہیں ہے تو سیر ہے، پکنک ہے سینما ہے، دعوت ہے کسی کے ہاں کھانا ہے یا کسی کو اپنے ہاں کھلانا ہے یا کوئی دوسرا

پروگرام ہے۔ قوالی ہے یا تھیٹر ہے۔ اُسے ہر دم کوئی نہ کوئی مشغولیت چاہیئے۔ وہ چُپ چُپ رہنے والے بور لوگوں کو قطعی پسند نہیں کرتی تھی۔ اگر پریم کمار کبھی سنجیدہ اور خاموش نظر آتا تو وہ اُسے فوراً گدگدانے لگتی۔ اُس پر تکیہ، تاش، جوتا، قلم، جراب کتاب جو سامنے آجائے پھینکنا شروع کرتی، یا تو اُسے ہنسا دیتی یا خفا کر دیتی اور خفا کر کے تو بہت خوش ہوتی۔ کیوں کہ جھگڑنے میں اُسے بڑا مزہ آتا تھا۔ جھگڑا کر کے وہ بہت سی اَنٹ شَنٹ باتیں سُنا دیتی تھی۔ رُوٹھ جاتی تھی، روتی تھی اور بڑی مشکل سے منائی جاتی تھی۔ اُسے رُوٹھ کر من جانے میں بڑا لُطف آتا تھا۔ وہ تین لاکھ کی ایکٹرس تھی حالانکہ اس کی عُمر صرف بائیس سال کی تھی۔

لیکن پریم کمار کو آرادھنا بھی بہت پسند تھی۔ ایک تو اس کی عمر بھی کم تھی، مشکل سے سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ مگر اٹھارہ برس کی عمر میں بھی جوانی گھٹا بن کر آرادھنا پہ برسی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوانی اس کے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ وہ زیادہ بات تو نہیں کرتی تھی لیکن اس کا جسم بہت بولتا تھا۔ اور اس کی آنکھیں بہت بولتی تھیں۔ اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں انگاروں کی سی آنچ تھی۔ آرادھنا بولتی کم تھی مگر کھینچتی زیادہ تھی۔ اس کی کشش مقناطیس کی طرح تھی اور جب پریم کمار اُس کے ساتھ سیٹ پر کام کرتا تو ساری دُنیا کو بھول جاتا۔ اُسے معلوم ہوتا اُس کی باہوں میں کوئی عورت نہیں ہے۔ سُلگتا ہوا ایک انگارا ہے جس سے اس کا سارا بدن جل جائے گا۔

پریم کمار، آرادھنا اور آرتی ان دونوں کے بیچ میں لٹک رہا تھا۔ اور یہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ کس سے شادی کرے۔ دونوں لڑکیاں ہیروئن تھیں، اُٹھتی ہوئی جوانی اور شہرت کی اونچی منزلوں کی جانب رواں دواں، خود پریم کمار کی عمر چالیس سے تجاوز کر گئی تھی اس لئے اب وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اسے اپنے مستقبل کی خاطر کسی نوجوان ہیروئن سے جلد شادی کر لینی چاہیئے۔ اب وہ اس صنعت میں تین چار سال سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ اس لئے گھر میں کوئی تو ہو جو اس کے بجائے فلم انڈسٹری میں چل سکے ورنہ

گھر کیسے چلے گا؟ اس طرح کے خیال اب اسے ستانے لگے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو کسی پکی عمر کے پکے ہوئے پھل کی طرح رس دار ہیروئن سے شادی کر سکتا تھا مگر وہ بھی دو چار سال چل کر رہ جائے گی۔ اس لئے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ وہ کسی نوعمر ہیروئن سے شادی کرے۔ جسے فلم انڈسٹری سے باہر جاتے ہوئے کم از کم بارہ سال تو لگیں اس سے آگے بھگوان جانے۔

اس لیے پریم کمار آرادھنا اور آرتی بالا کے بیچ میں لٹک رہا تھا۔ اور اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اسے کس سے سچی محبت ہے، آرادھنا سے یا آرتی بالا سے؟ مگر اب وہ اپنی عمر کی اُس خطرناک منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں اسے بہت جلد اپنی محبت کا فیصلہ کر دینا ہوگا اور ان دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کر لینی ہوگی۔ آج ہولی کے دن اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لینے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔

سوئمنگ پول کے چاروں طرف بے حد شور تھا کچھ لوگ بھنگ پی کر لان میں مدہوش تھے۔ پریم کمار کہہ رہا تھا "میں ایک سو روپے کی بلائنڈ چلتا ہوں"

کے این سنگھ بولا "میں اپنی دونوں آنکھوں سے بلائنڈ چلتا ہوں"

مکری نے کہا "میں ایک آنے کی بلائنڈ چلتا ہوں"

اوم پرکاش نے پوچھا "ایک آنہ ایک سو روپے کے برابر ہو سکتا ہے؟"

مکری بولا "ہو سکتا ہے اگر ہم سب لوگ ایمانداری سے ٹیکس دینے لگیں تو ایک آنہ ایک سو روپے کے برابر ہو سکتا ہے"

اس پر شمی کپور نے وحیدہ رحمان اور سادھنا کو پانی میں غوطہ دے دیا اور سوئمنگ پول کے کنارے راکی اینڈ بوائز کا بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔ یہ روایت تھی کہ جب کبھی کوئی فلم ہیروئن پانی میں گرائی جاتی تھی، کنارے پر بینڈ زور زور سے بجتا تھا اور لوگ پانی میں تیرتی ہوئی ہیروئن کی طرف پھول، گجرے اور ہار پھینکتے تھے۔ پھر پران نے جبلیں اور شیاما کو پانی میں دھکا دے دیا اور بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔ چند منٹ میں

بیشتر فلمی ستارے پانی میں کود گئے۔ اور سوئمنگ پول کی ٹونٹیوں سے طرح طرح کے رنگ دار پانیوں کے فوارے پھوٹنے لگے۔ اور وہ لوگ جھلملاتی ہوئی رنگین روشنیوں میں نہاتے ہوئے ایک دوسرے پر پانی پھینکتے ہوئے، ہنستے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے ہولی کی بہاروں میں کھو گئے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ ڈائیونگ بورڈ پر پریم کمار آرتی بالا کو لئے کھڑا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے بینڈ کو دھن چھیڑنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ آرتی بالا نے ایک لمحے کے لئے کسی طرح کی حجت نہیں کی۔ وہ مسکراتی ہوئی پریم کمار کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے ڈائیونگ بورڈ پر آئی۔ اس نے ہلکے جامنی رنگ کا ایک پھول دار بکنی سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ بار بار اپنی کمر لچکاتے ہوئے اٹھلا رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے پریم کمار نے اسے دھکا دیا اور لوگوں کے شور کے درمیان آرتی بالا ایک ابابیل کی طرح بازو پھیلائے ہوا میں اڑتی نظر آئی اور دوسرے لمحے میں دھم سے پانی میں کود گئی۔

چند منٹ بعد پریم کمار ڈائیونگ بورڈ سے غائب ہو گیا۔ حالانکہ پانی کی سطح سے ہاتھ پھیلا کر آرتی بالا اسے نیچے ڈائیو کرنے کو کہہ رہی تھی۔ گویا اُسے اپنی آغوش میں اُترنے کو کہہ رہی تھی۔ مگر پریم کمار اب آرادھنا کو پانی میں گرانے کی فکر میں تھا۔ اور سوئمنگ پول چھوڑ کر آرادھنا کو ڈھونڈنے کے لئے چلا گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر آرادھنا اسی کے گھر کے ایک کمرے میں چھپ گئی تھی۔ کیوں کہ وہ سوئمنگ پول میں نہانا نہیں چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے پریم کمار نے اُسے ڈھونڈا مگر آرادھنا کسی طرح تیار نہیں ہوئی "گھبراتی کیوں ہو؟" پریم کمار نے کہا، "تمہارا جسم تو سب سے خوبصورت ہے۔ چلو سوئمنگ پول میں، مرد دیکھتے ہی مر جائیں گے، عورتیں جل جائیں گی"

"نہیں مجھے شرم آتی ہے" آرادھنا گھبرا کر بولی۔

"ہولی کے دن شرم کیسی؟" پریم کمار نے پوچھا۔

"مجھے تیرنا نہیں آتا۔" آرادھنا نے دوسرا بہانہ کیا۔
"میں تمہیں پانی میں سنبھالے رہوں گا۔" پریم کمار نے وعدہ کیا۔
"نہیں۔"
"چلو۔" پریم کمار آرادھنا کو سوئمنگ پول کی طرف گھسیٹنے لگا۔
"نہیں، نہیں۔" آرادھنا برابر منع کرتی رہی اور پریم کمار اُسے زبردستی سوئمنگ پول کی طرف لے جاتا رہا۔ اسی کش مکش میں آرادھنا کا بلاؤز پھٹ گیا۔ اور اس کا جوڑا کھل گیا۔ اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ یکایک پریم کمار کو اس پر رحم آگیا۔ اس نے یکایک اپنا ہاتھ روک لیا۔ آرادھنا کو چھوڑ دیا۔ آرادھنا سکڑی، سمٹی، لجائی، خوف زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور رُک رُک کر بولی "جانے مجھے کیوں لاج آتی ہے، پریم مجھے وہاں مت لے جاؤ۔"

پریم کمار نے اُسے اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر پیار کیا۔ اُس کے آنسو پونچھے۔ پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر ڈائیونگ بورڈ پر لے گیا اور چلّا کر کہنے لگا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہمیٹ مائی وائف۔"

چند لمحے تو حیرت کا مکمل سکوت رہا۔ پھر سوئمنگ میں اس غضب کا طوفان آیا گویا سوئمنگ پول کا سارا پانی اُچھل کر تالاب سے باہر آجائے گا۔

جب میں نے رات کو پریم سے پوچھا "یہ تم نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا؟"
تو وہ بولا "آرادھنا اور آرتی بالا میں سے آرادھنا کی رُوح زیادہ شرمیلی ہے وہ فلم اسٹار ہو کر بھی لوگوں کی نظروں سے بچنا چاہتی ہے اس کی رُوح کے اندر ایک شریف عورت کی پاکیزگی ہے۔ یقیناً آرادھنا ہی میری سچّی محبت کے لائق ہے۔ میں اُس سے شادی کر رہا ہوں۔"

اُسی رات آرادھنا نے اپنے بھائی سے، جو دراصل اس کا شوہر تھا، کہا۔
"میں پریم کمار سے شادی کر رہی ہوں۔ تمہیں ایک لاکھ دے کر الگ کر رہی ہوں۔ تم شادی کے فوراً بعد یہاں سے چلے جاؤ گے اور پھر کبھی یہاں نہیں آؤ گے۔"

"ایک لاکھ دے دو میری رانی! میں تو کل ہی چلا جاتا ہوں۔"

"کل نہیں، شادی کے بعد۔"

"شادی کے بعد میری کیا ضرورت ہے؟"

"واہ! شادی کے بعد بھائی کی ضرورت ہوگی۔ ماں، باپ تو ہیں نہیں میرے۔ تم میرے بھائی بن کر میرا کنیا دان نہیں کرو گے تو مجھے بڑی لاج آئے گی۔"

بقیہ: سستی جوتیاں

عنایت کی ہیں۔"

امیر خسرو نے بیتابی سے دریافت کیا "کیا تم یہ جوتیاں فروخت کر سکتے ہو؟"

مسافر ضرورت مند تھا۔ کہنے لگا "کیا دو گے؟"

امیر خسرو بولے "یہ سب ہاتھی، گھوڑے، غلام اور تمام نقدی لے لو مگر جوتیاں مجھے دیدو۔"

مسافر نے بے دلی سے کہا "کیوں مذاق کرتے ہو بھائی؟"

امیر خسرو نے پیشانی پر بل ڈالے بغیر اسی وقت ساری چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور جوتیاں لے کر اپنی دستار میں باندھ لیں۔ یہ واقعہ لکھنؤ میں پیش آیا تھا۔ امیر خسرو وہاں سے دہلی تک تنہا، ننگے پاؤں، پیدل آئے اور جب وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سامنے پہنچے تو حضرت نے مسکرا کر کہا۔

"ترک! جوتیاں بہت سستی خرید لیں۔"

.....:.....

سستی جوتیاں

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں ایک سائل حاضر ہوا۔ اس وقت ان کے پاس اسے دینے کے لئے کچھ موجود نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی جوتیاں اسے دے دیں۔ سائل واپس چلا گیا۔

اُن دنوں امیر خسرو شہنشاہ کے ساتھ بنگال گئے ہوئے تھے۔ واپسی کے وقت انہوں نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ ان کا شمار چونکہ بادشاہ کے مصاحبوں میں ہوتا تھا۔ اس لئے ہاتھی، گھوڑوں، کنیزوں اور غلاموں کی بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی۔

اس دن سرائے میں یکایک امیر خسرو نے بڑی بے چینی سے کہا "بوئے پیر می آید بوئے پیر می آید (میرے پیر کی خوشبو آرہی ہے۔ میرے پیر کی خوشبو آرہی ہے)

لوگوں نے کہا "یہاں پیر و مرشد کہاں، ہم دلّی سے بہت دور ہیں"

لیکن امیر خسرو کے اضطراب میں کمی نہیں ہوئی۔ وہ یہی کہتے رہے "بوئے پیر می آید، بوئے پیر می آید"

لوگوں نے اِدھر اُدھر سونگھنا شروع کیا اور امیر خسرو کے اضطراب کا شہرہ ساری سرائے میں ہوگیا۔

اسی وقت امیر خسرو کا ایک ہم سفر بھاگا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ "آپ صحیح کہتے ہیں۔ ایک مسافر دلّی سے آیا ہوا ہے۔ شاید وہ حضرت کی خدمت میں گیا ہو اور ان سے کوئی عطیہ لایا ہو"

امیر خسرو فوراً مسافر کے پاس پہنچے اور اس سے حقیقت حال دریافت کی۔ مسافر نے کہا "ہاں میں حضرت کی خدمت میں گیا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ دو جوتیاں

بقیہ صفحہ نمبر

پالکی

تھانیدار نیاز احمد میرے پتاجی کا بہت گہرا دوست تھا دیکھنے میں وہ میرے پتاجی سے بھی بہت خوبصورت تھا۔ میرے پتاجی کی شکل وصورت بڑی اچھی تھی ان کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ، ور رنگ گندمی اور سانولے کے درمیان تھا وہ ہر ایک سے بڑی نرمی اور مٹھاس سے بات کرتے تھے اور جس سے بات کرتے تھے اس کا دل موہ لیتے تھے۔

مگر تھانیدار نیاز احمد کی بات اور ہی تھی۔ وہ کچھ اس طرح کا خوبصورت تھا جیسے لوگ تصویروں میں خوبصورت ہوتے ہیں اونچا پورا قد، چھ فٹ تین انچ کا جوان، پتلی کمر، چوڑا چکلا سینہ، دانت سفید اور متناسب، چھوٹی چھوٹی بل کھاتی ہوئی مونچھیں، چوڑی پیشانی پر کسی پرانے زخم کا داغ، جو اس کی سفید پیشانی پر ایک مستقل تیوری کی طرح معلوم ہوتا تھا چنانچہ جب وہ مسکراتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سوچ میں ڈوبا ہوا آدمی مسکرا رہا ہے اس کی یہ ادا عورتوں کو بہت پسند تھی۔

تھانے دار نیاز احمد اکثر دورے پر رہتا مگر جب دورے سے واپس آتا تو میرے پتاجی سے ہر روز شام کو ملتا۔ ان دنوں میرے پتاجی بہت رات گئے نیچے گھر میں آتے اوپر ہی ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں، جو اکثر خالی ہوتا تھا اور اگر خالی نہ ہوتا تھا تو خالی کرالیا جاتا۔ میرے پتاجی اور تھانیدار نیاز احمد کی بیٹھک جمتی تھی کیونکہ گھر میں ماں جی کا حکم چلتا تھا۔ گھر میں شراب پینے اور گوشت کھانے کی ممانعت تھی اور میرے والد دونوں ہی چیزوں سے کبھی کبھی شوق فرماتے تھے۔ تھانیدار نیاز احمد جب دورے سے واپس آجاتا تو ان کے دونوں شوق پورے ہوجاتے دونوں دوست اسپیشل وارڈ میں بیٹھ کر خود مرغ بھونتے طرح طرح کے مسالے گوشت میں ڈال کر تجربے کرتے، باتیں کرتے، گانے بہت رات گئے تک ان کے قہقہوں کی آوازیں باغ میں آتیں، میری ماں کا چہرہ اس دوران اڑا اڑا سا رہتا اور وہ دیر تک برآمدے کے چوبی ستون سے لگی اور عشق پیچاں کی بیل

کے قریب کھڑی میرے پتاجی کا انتظار کیا کرتیں رات کے کوئی گیارہ بارہ بجے اور کبھی کبھی ایک بجے کے قریب میرے پتا باغ کی نیلے نیلے ٹائلوں والی روش پر جھومتے جھامتے گھر آتے ہوئے دکھائی دیتے اور ان کے لبوں پر یہ گیت ہوتا۔

"پھٹی جب کان اس بن میں!"

میری ماں کو اس گیت سے بڑی چڑ تھی۔ گیت کیا تھا، بس یہی ایک مصرعہ تھا جو میرے والد اکثر شراب کے نشے میں اور شراب کے نشے کے بغیر بھی موج میں آکر گایا کرتے تھے۔

پھٹی جب کان اس بن میں!
اور میری ماں جھلا کر پوچھتیں۔

"آخر اس گیت کا مطلب کیا ہے؟ جب دیکھو اسے گا رہے ہو"

"بھلی مانس!" میرے پتا اسکول کے ماسٹر کی طرح ایک انگلی اٹھا کر کہتے

"اس گیت کا مطلب ہے پھٹی جب کان اس بن میں یعنی جب کان اس بن میں پھٹ گئی، پھٹ گئی، کان نہیں جانتی ہو؟ کان یعنی لوہے کی کان، نمک کی کان، پتھر کے کوئلے کی کان، کوئی بھی کان ہو جس کو بارود بھر کر اڑایا جاتا ہے کان سے مراد یہ تمہارا کان نہیں ہے جس میں یہ سونے کی بالیاں جھمک رہی ہیں، بھگوان کی سوگند جانکی آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو یہ رنگ روپ تم کہاں سے لائیں، تمہاری ماں تو بڑی بدصورت تھیں۔

"واہ کہاں بدصورت تھیں؟ میری ماں غصے سے چڑ کر کہتیں وہ تو خوب صورت تھیں، کچھ بھی ہو تمہاری ماں سے اچھی تھیں! اے کاکا تم یہاں کھڑے کیا سن رہے ہو، تم سے دس بار کہا ہے۔ جاؤ .... بھاگو ..... سو جاؤ ...."

"یہ ابھی تک جاگ رہا ہے" میرے پتا میری طرف دیکھ کر میرے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہتے .....

"باپ بارہ بجے تک شراب پیئے گا تو بیٹا کیسے سوئے گا؟" میری ماں غصے سے بھڑک کر اصل مطلب پر آجاتیں وہ لڑنا چاہتی تھیں، باپ طرح دینا چاہتے تھے۔ نیاز احمد سے ملاقات کے بعد ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا مگر اس لڑائی سے پہلے مجھے سونے کیلئے بھیج دیا جاتا تھا پھر دونوں میاں

یوی برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ کر لڑا کرتے تھے یہ بہت اچھی لڑائی ہوتی تھی کیونکہ میرے والد پل کر
بے حد شگفتہ ہو جاتے تھے اور بڑی جیداری سے میری ماں کی باتوں کا جواب دیتے تھے۔ ہوا کے
ہلکے جھونکے آتے، بہت دور ڈھلوانوں سے پرے ندی کا پانی چاندی کی طرح چمکتا اور عشق
پیچاں کے پھولوں کی مہک سے برآمدہ معطر ہوتا اس لئے اس نتھری نتھری سی پاکیزہ فضا میں لڑائی
بہت ستھری اور سلیقے سے ہوتی تھی۔ شطرنج کے کھیل کی طرح اس لڑائی کے بھی اصول تھے پہلے ماں
چالبولتی تھیں، میرے والد دبتے تھے، پھر بیچ میں میرے والد اونچا بولنے لگتے تھے۔ آخر میں میری
ں روہانسی ہو جاتیں اور دھیرے دھیرے سسکنے لگتیں۔ یہ ایک سگنل تھا کہ اب صلح ہو گی اس کے
میرے پتا آرام کرسی سے اٹھ کر آتے اور بڑے پیار سے میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر بے حد لجاجت سے
فی مانگنے لگتے اس کے بعد میں کچھ نہ دیکھتا۔ خوشی سے لحاف میں دبک کر سو جاتا، جتنے دن نیاز
سے صحبت رہتی، یہی کچھ ہوتا تھا۔

نیاز احمد کی بیوی مر چکی تھی لیکن اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ پہلی شادی سے ایک
تھا جو بڑے شہر میں پڑھتا تھا۔ نیاز احمد کی عمر پینتیس برس سے کم کی نہ ہو گی لیکن دیکھنے میں وہ مشکل
پچیس برس کا دکھائی دیتا تھا وہ بڑا کسرتی جوان تھا اور جب وہ صبح سویرے اپنے قلعے نما تھانے کی
یاں اتر کر گھوڑا دوڑاتا ندی کنارے جاتا اور لنگوٹ باندھ کر کسرت کرتا تو صبح کی لطیف سنہری دھوپ
اس کا گورا بدن کندن کی طرح چمکتا تھا اور سر پر گھڑے رکھے راہ چلتی عورتیں اسے کنکھیوں سے
جاتیں پھر کر نظر جھکا لیتیں، پھر دیکھنے پر مجبور ہو جاتیں پھر پھر کر نظر جھکا لیتیں اور ایک گہری آہ
اپنی راہ چلی جاتیں۔ نیاز احمد کو یہ معلوم تھا کہ اس پر ایک ہزار ایک شادی شدہ اور غیر شادی شدہ
مرتی ہیں اچھے اچھے خاندان والے گھروں سے اس کے لئے شادی کے پیغام آتے تھے مگر وہ شادی
تھا کیوں نہیں کرتا یہ بھی ایک راز تھا جس کا صرف میرے پتا کو علم تھا۔

کچھ عرصے سے نیاز احمد کے معمول میں تبدیلی آ چکی تھی پہلے تو وہ لمبے لمبے دورے کیا کرتا تھا
میں صرف چار چھ روز کے لئے واپس صدر مقام پر آتا تھا اس لئے چار چھ روز کی بری صحبت تو
میرے پتا جی کے لئے روپیٹ کر گوارا کر لیتی تھی لیکن ایک سال سے نیاز احمد کے دورے کم ہوتے

جاتے تھے پہلے دو مہینے میں صرف چار چھ روز کیلئے آتا تھا پھر وہ آٹھ دس روز کیلئے آنے لگا پھر بارہ پند
روز کے لئے پھر بیس روز کے لئے قیام کرنے لگا، اب گزشتہ چار ماہ سے وہ یہیں صدر مقام پر
ٹھہرا ہوا تھا ان چار ماہ میں وہ ایک بار بھی دورے پر نہیں گیا یہ میری ماں کے لئے بڑا مصیبت کا وقت

پھر ایک روز رات میں بڑی بھگدڑ مچی، فوج نے ہمارے بنگلے کا محاصرہ کر لیا نہ صرف ہمارے
بنگلے کا، بلکہ جہاں جہاں دوسرے افسر لوگ رہتے تھے ان سب کے بنگلے فوج کے گھیرے میں لے لئے
گئے اور ان سب کے گھروں کی تلاشی لی جانے لگی سارے صدر مقام میں جگہ جگہ مشعلیں سی جلتی
معلوم ہوتی تھیں اور لوگ گھبرا کر ادھر ادھر جا رہے تھے پولیس کے دستے گشت کر رہے تھے اور مخبر
مکانوں کی تلاشیاں لے رہے تھے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ راجہ جانے تھانیدار نیاز احمد کی گرفتاری
احکام جاری کئے ہیں اور انعام بھی رکھا ہے جو کوئی راجہ جی کے سامنے نیاز احمد کو زندہ یا مردہ
پیش کرے گا، اسے ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا اسی سلسلے میں وزیر سے لے کر ڈاکٹر تک
بڑے آفیسر کے مکان کی تلاشی لی جا رہی تھی کیونکہ تھانیدار نیاز احمد آفیسروں میں بہت مقبول تھا
پولیس نے راتوں رات تمام بنگلے، چپہ چپہ چھان ڈالا مگر نیاز احمد کا کہیں پتہ نہ چلا۔ فوج کے
جانے کے بعد دیر تک میری ماں اور باپ بستروں میں پڑے کھسر پھسر کرتے رہے ان کے خیال کے مط
میں سو رہا تھا پھر بھی معاملہ اس قدر اہم تھا کہ وہ لوگ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے

دراصل قصہ یہ تھا کہ نیاز احمد ہمارے ہی گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ میری ماں
اسے پوجا کے کمرے میں رام اور سیتا کی مورتی کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ فوج کے لوگوں نے گو پوجا کا کمرہ بھی کھ
کے دیکھا مگر وہ کمرے کے اندر نہ گھسے صرف دروازے سے اندر جھانک کر ہی چلے گئے کیونکہ وہ پوجا کا
تھا اور لوگ میری ماں کے سخت مزاج سے واقف تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میری ماں اپنے دھرم کے
کی پابندی کتنی سختی سے کرتی ہیں چنانچہ انہیں اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ میری ماں ایک مسلمان کو
پوجا کے کمرے میں گھسنے دیں گی اور اسے اپنے مقدس اشٹ دیو کی مورتی کے پیچھے چھپا دیں گی۔

اور میری ماں واقعی ایسا کبھی نہ کرتیں اگر میرے پتا لڑ جھگڑ کر انہیں اس بات کے لئے مجبور نہ کر دیتے
میرے باپ نے غصے میں آکر ندی میں ڈوب جانے کی دھمکی دی تھی اس پر میری ماں راضی ہو گئیں مگر خو
جانے کے بعد وہ پھر دھیرے دھیرے میرے باپ سے جھگڑنے لگیں۔

"میں تم سے کہتی ہوں کہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا تم اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

"اور وہ جو بے چارہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا؟ اس کا کچھ خیال نہیں ہے۔"

"وہ اپنے کئے کی سزا پائے گا کیوں اس نے ایسا کیا"

"اس نے کہاں کچھ کیا تھا جب راجہ جی کی بہن ہی اس پر عاشق ہوگئی تو وہ کیا کرتا؟"

"کیا کرتا؟" میری ماں غصے سے بولیں۔ "اسے منع کر دیتا راجہ راجہ ہے، ملازم ملازم ہے روہ ہندو، وہ مسلمان۔ اس کا پری نام کچھ اچھا نہیں ہو سکتا تھا اس سے دونوں کا دھرم بھرشٹ ہوتا۔"

"محبت دھرم نہیں دیکھتی۔"

"تم تو ناستک ہو میں سمجھتی تھی تم آریہ سماجی ہو تم ایک مسلمان کو اپنے گھر میں پناہ دو گے مگر تم تو آریہ جی سے بھی گئے گزرے۔ تم تو ٹھیٹ ناستک ہو۔"

"دوستی بھی تو کوئی چیز ہے!"

"اور دھرم کوئی چیز نہیں ہے اپنے مذہب کا تمہیں کوئی پاس نہیں ہے اس کی یہ ہمت کہ تمہارے کی بہن سے پیار کرنے چلا ہے اور تمہاری یہ غیرت کہ اسے گھر میں پناہ دے رہے ہو۔"

"جانکی" میرے باپ نے اپنے بستر سے جھک کر نرمی سے میری ماں کی بانہہ پکڑ لی اور انھیں سمجھاتے ہوئے بولا "تم نہیں جانتی ہو دوستی بھی تو ایک دھرم ہے، وہ خود ایک مذہب ہے، اس کے اپنے اصول ہیں، جس طرح تمہارے دھرم کے اصول ہیں۔"

میری ماں نے اپنی بانہہ چھڑاتے ہوئے کہا

"ہوں گے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اپنے دھرم کے اصولوں کو میرے دھرم کے اصولوں لاد دو میں جس مندر میں تمہیں اشنان کئے بغیر نہیں جانے دیتی تھی میں نے اسی مندر میں تمہارے ن دوست کو چھپا لیا ہے نہ جانے بھگوان مجھے اس کی کیا سزا دیں گے؟ کیونکہ انہیں نے اُن کا مندر نشٹ کر دیا ہے، زندگی میں جو کام میں نے کبھی نہیں کیا تھا، وہ بھی تم نے مجھ سے کرا لیا....."

میری ماں رونے لگیں

پتا جی اسے دلاسا دینے لگے۔

"چند دنوں کی بات ہے اس کے بعد جب معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے گا اور پولیس او
فوج کی دوڑ دھوپ کم ہو جائے گی تو وہ خود ہی ہمارا گھر چھوڑ دے گا اور اس علاقے سے بھاگ
جائے گا یہاں تو اسے جان کا خطرہ ہے۔"

"اس کی جان ہی کو نہیں، تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے، یہ مت بھولو کہ تم بھی راجہ جی کے ملازم ہو
اور ملازم ہوتے ہوئے درپردہ ان سے غداری کر رہے ہو میں اب تم سے زیادہ نہیں کہتی صرف اتنا کہتی ہو
کہ اپنے دوست سے کہہ دو کہ وہ سنکرانت سے پہلے یہاں سے اپنا منہ کالا کر جائے سنکرانت کے دن
میں اس مندر کو اپنے ہاتھوں گنگا جل سے دھو کر صاف کروں گی اور پنڈت جی کو بلا کر اکیس دن کی کتھا رکھوا
پاٹ کروں گی، ہون کروں گی پراشچت کا بھوگ اکیس براہمنوں کو کھلاؤں گی۔ جب جا کے کہیں میرے د
کو چین آئے گا۔"

دوسرے کمرے میں کچھ آہٹ سی ہوئی میرے پتاجی نے گھبرا کر کہا

"آہستہ بولو، آہستہ بولو کہیں وہ سن نہ لے۔"

"سن لے تو اچھا ہے!"

ماں اور بھی جھلا کر بلند آواز میں بولیں۔

شش کہہ کر میرے پتاجی نے میری ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر پھونک مار کر
لیمپ بجھا دیا۔

ساتھ والے جس کمرے میں نیاز احمد کو چھپایا گیا تھا اس میں پھر ذرا سی آہٹ ہوئی پھر چاروں
طرف خاموشی چھا گئی ان دونوں کمروں کے درمیان کا دروازہ دوسری طرف سے بند تھا روشندان ذرا
کھلا تھا پتاجی نے ماں سے کہا:

"کل صبح اس روشندان کے شیشے پر سیاہی پھیر کر اسے بھی بند کرا دینا۔"

"بہت اچھا!"

میری ماں نے سرگوشی میں کہا۔

پھر وہ سونے سے پہلے مُنہ ہی مُنہ میں کوئی جاپ کرنے لگیں، یہ اُن کا دستور تھا۔

دوسرے دن صبح کے وقت میری ماں سب سے پہلے اُٹھیں، ابھی نوکر سوئے پڑے تھے کہ انھوں نے نیاز احمد کے لئے چائے اور ناشتے کا سامان تیار کر لیا اور سب چیزیں ایک ٹرے میں سجا کر پوجا کے کمرے میں لے گئیں مگر فوراً ہی لوٹ آئیں انھوں نے جلدی جلدی بیڈ روم میں آکر میرے والد کو جگایا اور اُن سے کچھ کہا دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں میرے والد گھبرا کر بستر سے اُٹھے اور پائجامے کا الاربند اڑستے ہوئے بولے۔

"کدھر؟ کہاں؟ کیسے؟"

میری ماں آہستہ سے بولیں

"تم خود چل کے دیکھ لو"

پتاجی بھاگے بھاگے پوجا کے کمرے میں گئے مگر وہاں نیاز احمد نہ تھا۔ کمرے کے عقب میں ایک کھڑکی کھلی تھی وہ رات کی تاریکی میں کھڑکی کھول کر کہیں فرار ہو گیا تھا....

اسی دن صبح کو آٹھ بجے کے قریب قلعہ نما تھانے کی سیڑھیوں کے نیچے کچی سڑک کے کنارے اس کی لاش پائی گئی کسی نے اُسے مار کر اس کی لاش کے چار ٹکڑے کر دیئے تھے اور کوئی اسے زندہ یا مُردہ لانے کا انعام لینے بھی نہ آیا تھا۔

جس وقت میرے پتاجی منہ دھو کر ناشتہ کر رہے تھے ہسپتال کے اردلی نے انہیں اطلاع دی تھانے دار نیاز احمد کی لاش پوسٹ مارٹم کیلئے آچکی ہے۔ پتاجی نے گھور کر غضب ناک نظروں سے میری ماں کی طرف دیکھا اور میری ماں نے خائف اور پشیمان ہو کر اپنی نگاہیں جھکا لیں پتاجی ناشتہ کئے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے اور ماں کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا اور کرسی پر جھک کر رونے لگیں۔

میرے پتاجی نے دو دن تک کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک میری ماں سے بات نہ کی پھر

سنکرات آگئی اور میں حسبِ سابق ست ناجے میں نئا میری کوری دھوتی مشرجی کو دے دی گئی اور ماں مجھے گوردوارے لے گیئں۔ گوردوارے کے باہر والے مندر میں ہم نے گھنٹے بجائے اور پھر ہم وہاں سے شاہ مُراد کے مزار کی طرف چل دیئے لیکن آج میری ماں بہت اداس تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نہ جانے کیا خیال کر کے آب دیدہ ہو جاتی تھیں۔ جب ہم ڈھکی اُتر کر شاہ مُراد کے مزار کے قریب پہنچے تو کیا دیکھا کہ مزار کے قریب کی سنسان پگڈنڈی پر شاہی محل کی ایک پالکی رکھی ہے اور اس کے گرد چار کہار کھڑے ہیں۔ میری ماں شاہی ڈولی دیکھ کر وہیں ٹھٹھک گیئں اور مجھے لے کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیئں اور دیر تک چپ چاپ کھڑی رہیں آخر انھوں نے چپکے سے کہا۔

"تو بچہ ہے تجھے شاہی محل کے کہار جانے دیں گے جا کے دیکھ تو سہی مزار پر کیا ہو رہا ہے"

میں ان کی اجازت لیتے ہی بگٹٹ دوڑا اور پاؤں سے کنکر اڑاتا، پتھروں کو ٹھوکریں مارتا مزار کی طرف بڑھتا گیا۔ جدھر گھنی بیریوں کا جھاڑ تھا، کہاروں نے مجھے تو کچھ نہیں کہا لیکن جرے نے مجھے دور سے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اشارے سے وہیں رک جانے کو کہا، میں ایک جھاڑی کے قریب رک گیا، دبک کر چھپ گیا میں نے سمجھا یہ بھی جرے کا کوئی نیا کھیل ہے۔ جرا میرے پاس آکر آہستہ سے بولا

"مزار پر کوئی نہیں جا سکتا اس وقت!"

"کیوں؟"

میں نے دھیرے سے پوچھا

جرے نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

صرف اتنا کہا۔

"میں تم کو لے چلوں گا!"

"کیسے؟"

میں نے پھر پوچھا۔

مگر جرے نے پھر میری بات کا کوئی جواب نہ دیا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سنتھے کی جھاڑیوں کے...

نیچے سے گھٹنوں کے بل چل کر کہیں مڑ کر کہیں رک کر بیریوں کے جھنڈ کے اندر آیا، وہاں ہم دونوں دبک کر بیٹھ گئے اور بیریوں کی شاخیں ہٹا کر دیکھنے لگے۔

چاچا رمضانی مزار کے قریب بیٹھے تھے ان کے سامنے سفید برقعے میں ایک عورت کھڑی تھی۔

"شاہی محل کی رانی ہوگی"

میں نے دھیرے سے کہا

اور ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ برقعہ عام طور پر مسلمان عورتیں پہنتی ہیں اور وہ بھی کالا ہوتا ہے سفید برقعہ صرف وہ ہندو عورتیں پہنتی ہیں جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

چاچا رمضانی کی گھگی بندھی ہوئی تھی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سفید برقعہ والی عورت کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کا تسبیح والا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

برقعے والی عورت نے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا۔

"اور تم میری آمد کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے"

رمضانی نے نفی میں سر ہلایا۔

"اور تم سب نذر دنیاز دو گے؟"

رمضانی نے اس بات میں سر ہلایا۔

"اور تم قبر پر روز دیا جلاؤ گے، پھول چڑھاؤ گے اور وہ سب کام کرو گے جو اس سلسلے میں کئے جاتے ہیں!"

پھر رمضانی نے اس بات میں سر ہلایا

سفید برقعے والی عورت دیر تک برقعے کے اندر سے رمضانی کو گھورتی رہی۔

اس کے بعد برقعہ کے ایک کونے سے دو تین پتلی پتلی نازک سی مخروطی انگلیاں پل بھر کیلئے باہر نکلیں پھر برقعے میں چھپ گئیں اور سو سو کے کئی نوٹ رمضانی کی جھولی میں گر پڑے۔

رمضانی جلدی جلدی تسبیح پھیرنے لگا۔

"قبر کہاں ہے؟"

اس عورت نے اسی طرح تحکمانہ لہجے میں پوچھا

چاچا رمضانی آنکھ کے ایک کونے سے صرف ایک اشارہ ہی کر سکا مگر اس عورت نے سب سمجھ لیا اور بڑے مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی مزار کی سیڑھیاں اتر کر قبرستان میں چلی گئی۔

اب میں اور دریا بھی منہ موڑ کر قبرستان کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ عورت ایک قبر کے قریب جا کر رک گئی اور دیر تک وہیں خاموش کھڑی رہی پھر وہ یکایک اس قبر پر گر پڑی اور اس کے دونوں ہاتھ قبر پہ پھیل گئے۔

اور ان ہاتھوں کی انگلیاں قبر پر اس طرح تڑپنے لگیں جس طرح بہت ہی پتلے پانی میں مچھلیاں تڑپتی ہیں۔

پھر وہ انگلیاں بھی ساکت ہو گئیں۔

اور یکایک بدلیوں میں گھرا سناٹا چھا گیا۔

مزار پر اندھیرا سا ہو گیا۔

اور چاچا رمضانی کی تسبیح کے دانے کانپنے لگے اور میں اور دریا حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

ایک لمبے سکوت کے بعد وہ عورت وہاں سے اٹھی لیکن اب اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور اس کا سفید براق برقعہ بھوری مٹی سے اٹا ہوا تھا وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہانپتی کانپتی ہوئی جھاڑیوں اور چٹانوں سے الجھتی ہوئی مزار کے اوپر کی پگڈنڈی پر پہنچ گئی اور کسی سے کچھ کہے بغیر پالکی میں بیٹھ گئی۔

کہاروں نے پالکی کا پردہ گرا لیا۔

اور اسے اٹھا کر چل دیئے! اور چند لمحوں میں ہماری نظروں سے غائب ہو گئے۔

اوورٹیک

لنکنگ روڈ کے اڈے پر تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں اُن کی طرف غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا چلا آرہا تھا، اور ابھی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ کس میں بیٹھوں کہ اتنے میں ایک آواز آئی۔ "ادھر آؤ جی، اپنے بچن سنگھ کی ٹیکسی میں بیٹھو۔ ادھر کدھر منہ اٹھائے بھاگے جارہے ہو بادشاہو؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹیکسیوں کے اڈے کے بالکل سامنے ایرانی ریستوراں کے باہر ایک دبلا پتلا نیز لہجے اور شریر آنکھوں والا بچن سنگھ اپنی ٹیکسی سے ہاتھ نکالے مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے اور سفید سفید دانتوں سے منہ کھولے ہنس مکرا رہا ہے۔

بچن سنگھ کی صورت جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ چاہے زندگی میں آپ نے انھیں پہلے کبھی نہ دیکھا ہو لیکن پہلی ہی ملاقات میں ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا برسوں کی ملاقات ہے۔ میں جلدی سے ٹیکسی کا پٹ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھنے سے پہلے بچن سنگھ نے فلیگ گرا دیا تھا اور اب میٹر چالو کر کے لنکنگ روڈ سے ٹھوڑ بندر روڈ کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

"آپ بھول گئے مجھ کو، اُس دن آپ مجھے بھانڈوپ اپنے گھر سے لے کر چنچ پوکلی آئے تھے؟ کوئی تین ماہ کی بات ہے۔!"

مجھے معلوم تھا کہ میں بھانڈوپ میں نہیں رہتا اور نہ کبھی چنچ پوکلی جاتا ہوں مگر مجھے کہنا ہی پڑا "آں ہاں! یاد آیا۔ خوب یاد آیا کہیئے بچن سنگھ جی! مزاج تو اچھے ہیں؟"

"واہ گرو کی کرپا ہے مگر آپ تو مجھے بھول ہی گئے تھے اور کسی دوسری ٹیکسی میں بیٹھنے والے تھے۔ بچن سنگھ کسی قدر خفا ہو کر بولا۔ "مگر میں تو اپنے گاہکوں کو پہچانتا ہوں۔ ایک دفعہ صورت دیکھ لوں تو زندگی بھر نہیں بھولتا۔ یاد ہے، آج سے پانچ ماہ پہلے اگست کی ایک بھیگی ہوئی شام میں آپ نے فلابے سے ایک لڑکی اٹھائی تھی۔ مس بوناوالا اس کا نام تھا۔ رات کے دو بجے میں نے آپ کی مس بوناوالا کو کھڑا پارسی کے چوک میں چھوڑ کے آیا تھا۔ یاد ہے؟"

اب میں کیا کہتا کہ قلابے سے لڑکی اُٹھانے کی مجھے آج تک حسرت ہی رہی۔ اتنے پیسے ہی کبھی جیب میں نہ ہوئے اور مس بوتا والا؟ میری بیوی اگر کہیں سُن لے تو مار مار کر مجھے جوتا والا بنا دے مگر بچن سنگھ نے اس فراٹے سے گاڑی گھما کر ایک ٹرک کے قریب سے نکالی کہ میرا سانس اُوپر کا اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے ہانپتے ہوئے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"کیا یاداشت ہے آپ کی بچن سنگھ جی! کچھ بھولتے ہی نہیں ہو مگر گاڑی ذرا آہستہ چلاؤ۔"

"بھولنے کے دن تو بچن سنگھ پیدا ہی نہیں ہوا۔" بچن سنگھ نے خوش ہو کر کہا اور اس خوشی میں گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔ "اور پھر وہ چیز بھی اچھی تھی!" بچن سنگھ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ بھُنے ہوئے تیتر کی طرح خستہ رہی ہو گی۔ کیوں؟"

یہ کہہ کر بچن سنگھ نے ایسی شریر نگاہوں سے میری طرف دیکھا کہ میں جھینپ گیا اور ٹیکسی پٹرول لے جانے والی لاری سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ بچن سنگھ لاری والے کو گالیاں دینے لگا۔ "دیکھ کر نہیں چلاتے ہیں یہ حرام زادے! ابھی تیرے پٹرول میں ایک تیلی ڈال کر پھونک دوں گا جانے کس احمق نے تجھے لائسنس دیدیا ہے؟"

"مگر تم خود ہی پیچھے دیکھ رہے تھے۔ اپنے گاہک سے باتوں میں مشغول تھے۔" لاری ڈرائیور بولا۔ "وہ تو میں نے ایکسیڈنٹ سے بچا لیا ورنہ۔"

مگر بچن سنگھ نے پوری بات نہیں سُنی، گاڑی آگے بڑھا کے لے گیا اور جاتے جاتے مجھ سے کہنے لگا۔ "دیکھ لیا آپ نے؟ یہ لاری ڈرائیور کتنے حرامی ہوتے ہیں۔ بے تحاشا تیز رفتار سے گاڑی چلاتے ہیں نہ آگے دیکھتے ہیں نہ پیچھے اور قصور وار ہم غریب ٹیکسی ڈرائیوروں کو ٹھہراتے ہیں۔"

"بے شک، بے شک، اس میں کیا شبہ ہے؟" میں نے کمزور لہجے میں کہا حالانکہ غلطی اسی کی تھی مگر بچن سنگھ کو ٹوکنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ "مگر میں نے بھی سالے کی طبیعت صاف کر دی۔ اوئے موڑتوں بڈھے۔" بچن سنگھ نے ایکدم بریک لگائی پھر بھی سامنے سے گزرتا ہوا ایک بڈھا اس کی ٹیکسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

بچن سنگھ گاڑی کو ریس کرتے ہوئے بولا۔ "اگر میں گاڑی احتیاط سے نہ چلاتا تو یہ بڈھا تو

اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ہاہاہا۔ کہاں جانا ہے جی آپ کو؟"

میرا جی تو وہیں اُترنے کو چاہ رہا تھا مگر آس پاس کوئی ٹیکسی خالی نہ دیکھ کر مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑا۔ "دھوبی تلاؤ جاؤں گا۔ مگر ٹیکسی احتیاط سے چلاؤ بچن سنگھ جی!"

بچن سنگھ کو میرا مشورہ پسند نہیں آیا۔ بولا۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں بابوجی۔ احتیاط تو ہر ٹیکسی ڈرائیور کے لئے لازم ہے۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا تو آپ کا کیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک ٹانگ ٹوٹ جائے گی مگر میری تو ٹیکسی ٹوٹ جائے گی اور ہزاروں کا نقصان الگ ہو گا اور لائسنس الگ ضبط ہو گا اور روزگار سے بھی جائیں گے۔ اپنے لئے تو بڑی مصیبت ہے۔ اس لئے میں ہمیشہ ٹیکسی بڑی احتیاط سے چلاتا ہوں۔ ادھو یہ گجراتی سیٹھ کا ڈرائیور بڑا پاٹے خان معلوم ہوتا ہے۔ میری گاڑی کو آپ کے سامنے۔ دیکھا آپ نے؟ ناں ناں، صاف کہیئے۔ آپ کے سامنے اس نے اوورٹیک کیا کہ نہیں میری گاڑی کو؟۔ میں اس کو ایسے نکل جانے دوں گا سالے کو؟ سمجھتا کیا ہے بے تو، بچن سنگھ سے گاڑی آگے لے جائے گا؟"

یہ کہہ کر بچن سنگھ نے ایکسیلیٹر پر جو پاؤں رکھا تو زوم سے آگے بڑھ کر گجراتی سیٹھ کی گاڑی کے ساتھ ساتھ آگیا۔ اب دونوں گاڑیاں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ بچن سنگھ کی ٹیکسی اور گجراتی سیٹھ کی گاڑی۔ اور بچن سنگھ کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ "کیوں بے مدراسی!" بچن سنگھ گجراتی سیٹھ کے ڈرائیور سے کہنے لگا۔ "میری فیٹ کے مڈگارڈ میں تو چیاتی مارو، رانگ سائیڈ سے اوورٹیک کرتا ہے؟"

"کیا بکتا ہے؟" جنوبی ہند کا رہنے والا ڈرائیور بھی طیش کھا کر بولا۔ "رانگ سائیڈ سے تم اوورٹیک کیا میری گاڑی کو دو دفعہ اور دو دفعہ ہم چپ رہا مگر ہم بھی ڈرائیور ہے کوئی حجام نہیں ہے۔ اجاستی لفڑا کرے گا تو نیری مارس کا منہ توڑ کے لدھیانہ بنا دے گا!"

اس کے بعد بچن سنگھ نے نہایت نفیس پنجابی میں نوک پلک سے آراستہ ایسی گالی دی جو مدراسی ڈرائیور کے دل میں گھس کر اس کی سات پشتوں پر حملہ کر گئی۔ جواب میں دوسرے ڈرائیور نے جو اپنے منہ کی مشین گن کھولی تو دہلی سے امرتسر تک پوری پنجابی قوم کا صفایا کر دیا ساتھ

ساتھ دونوں گاڑیوں کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ بڑی مشاقی سے دائیں بائیں کی گاڑیوں، لاریوں، ٹرکوں سے بچتے ہوئے وہ دونوں ڈرائیور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے رہے دونوں گاڑیوں کے درمیان صرف چھ سات انچ کا فاصلہ تھا۔ اسٹیرنگ وہیل کی ایک ذرا سی غلط حرکت یا لغزش پر پچاس میل کی رفتار پر چلنے والی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا سکتی تھیں۔ ادھر گجراتی سیٹھ کا چہرہ فق تھا۔ ادھر میرا دل دھک دھک تھا اور ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ باندرے کا چوک گزر گیا۔ باندرے کی مسجد گزر گئی۔ دونوں گاڑیاں ماہم کریک پر دوڑتی ہوئی چیک نلکے کے قریب ہوتی گئیں۔ نلکے کے بالکل قریب جاکر سڑک کے دو حصے ہو جاتے تھے ایک حصے پر صرف پرائیویٹ گاڑیوں کو گزرنے کی اجازت تھی۔ دوسرے سے لاریاں، بسیں اور ٹیکسیاں گزرتی تھیں۔ مدراسی ڈرائیور گالیاں بکتا ہوا اپنے رستے پر چلا گیا۔ بچن سنگھ نے ٹیکسی سلو کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "سالا بھاگ گیا! دیکھا آپ نے؟"

میں نے ہنسنے کی کوشش کی مگر میرے حلق سے ایک ایسی آواز نکلی جو صرف نزع کے عالم میں کسی آدمی کے حلق سے نکل سکتی ہے، چیک نلکے پر پولیس کے سنتری نے بچن سنگھ سے پوچھا۔ "کائے رے بچن سنگھ؟ کیا مال ہے تیری گاڑی میں؟"

"ایک درجن بوتلیں ٹھرّے کی ڈکی میں رکھی ہیں" بچن سنگھ قہقہہ مار کر بولا۔ "اور ایک نو ٹانک میرے سیٹھ نے پی رکھی ہے اور دو نو ٹانک میں نے، یقین نہ آئے تو سونگھ کر دیکھ لے سنتری زور سے ہنسا۔ "جا، جا مسکری کرتا ہے مگر کبھی تو پکڑا جائے گا بچن سنگھ! ہاتھ ہلا کر سنتری نے راستہ دیدیا۔ بچن سنگھ فراٹے سے گاڑی نکال کے ماہم بازار میں لے آیا اور سیدھا شیواجی پارک جانے کے بجائے کھودا گلی میں گھس گیا۔

"ادھر کہاں جانا ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"بس ایک منٹ کا کام ہے یہاں" بچن سنگھ نے ایک گندے چھپرے کے قریب اپنی گاڑی روک کر اترتے ہوئے کہا۔

گاڑی سے اُتر کر اس نے دو دفعہ ہارن بجایا۔ چھپرے میں سے ایک بنیان اور پتلون پہنے ہوئے سفید بالوں والا ایک بڈھا نکلا۔ اُس کے گلے میں ایک چھوٹی سی صلیب لٹکی ہوئی تھی۔ ڈکی کھول کر بچن سنگھ نے اس کے ہاتھ میں بھورے رنگ کا ایک بڑا تھیلا تھمایا۔ جب بڈھے عیسائی نے تھیلا اپنے ہاتھ میں لیا تو تھیلے کے اندر سے بوتلوں کے ٹکرانے کی آواز آتی۔

"پوری بارہ ہیں!" بچن سنگھ نے مسکرا کر کہا۔

بڈھے عیسائی نے اندر جیب میں ہاتھ ڈال کر بڑی راز داری سے اُسے بچن سنگھ کے ہاتھ کی طرف بڑھایا۔ دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے پرانے دوستوں کی طرح بغل گیر ہوئے۔ پھر بچن سنگھ کا ہاتھ جلدی سے اس کی جیب میں چلا گیا۔ اور بڈھے عیسائی کا ہاتھ پتلون کے باہر ہی رہا جلدی سے بچن سنگھ نے گاڑی میں بیٹھ کر اُسے اسٹارٹ کیا اور کھودا گلی سے درشن لین سے ہو کر کیڈل روڈ پر ہو کر سری نواس سے شیواجی پارک کے چوک پر آ گیا۔ دس منٹ کا راستہ تھا جو غالباً اس نے دو منٹ میں طے کیا ہوگا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے بولا۔ "کبھی کبھی سچ بولنے سے بڑا فائدہ ہوتا ہے جی! وہ سپاہی میرا سچ جھوٹ سمجھا اور غچا کھا گیا، ہا ہا ہا۔ کدھر سے لے چلوں، خداداد سرکل سے یا پورچوگیز چرچ سے؟" پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی بولا۔ "ادھر دادر سے جے جے اسپتال تک بڑی گردی رہتی ہے۔ اس لئے پورچوگیز چرچ سے چلتا ہوں، راستہ بھی کھلا ملے گا اور..."

میں نے اُسے ٹوک کر ذرا سختی سے کہا۔ "جدھر راستہ کھلا ملے، ادھر سے چلو مگر احتیاط سے چلو!"

"احتیاط تو لازم ہے!" بچن سنگھ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "اور ٹیکسی تو میں ایسی احتیاط سے چلاتا ہوں کہ دوسرے ڈرائیور میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ بولتے ہیں بچن سنگھ تو تو بالکل چوہے کی طرح ڈرپوک ہے!"

میں نے دل میں سوچا۔ اگر یہ ڈرائیور چوہا ہے تو شیروں کی رفتار کا کیا عالم ہوتا ہوگا مگر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ بچن سنگھ ذرا سنجیدہ ہو کر چالیس کی رفتار سے ٹیکسی چلاتا رہا

اتفاق سے اسے راستے میں ..... کوئی موٹر گاڑی یا لاری بھی نہیں ملی جسے وہ اوور ٹیک کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ چند لمحوں کے لئے اسٹیئرنگ وہیل سے اٹھا لیئے اور سامنے کا آئینہ ترچھا کر کے اس میں سے دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی پگڑی ٹھیک کرنے لگا۔ سامنے سے ایک بڑا ٹرک چلا رہا تھا۔ قریب آ رہا تھا۔ قریب آ گیا ..... بالکل قریب آ گیا۔

یکایک میں نے چیخ کر کہا۔ ارے کیا کرتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟"

بچن سنگھ نے بڑی پھرتی سے وہیل گھمایا۔ ٹرک ایک فٹ کے فاصلے سے دہاڑتا ہوا قریب سے گزر گیا۔ ساری زمین کانپ اٹھی۔ میرے چہرے سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔ بچن سنگھ ہنس کر بولا اور اس کی آواز میں تھوڑی سی حقارت بھی تھی۔ "بابو جی، آج مرنا، کل مرنا، پھر مرنے سے کیا ڈرنا؟۔ اگر آئی ہو گی تو گھر بیٹھے بیٹھے مر جاؤ گے نہیں تو یہ ٹیکسی تو کیا پہاڑ سے کود پڑو گے تو بھی بچ جاؤ گے!" بچن سنگھ نے یہ کہہ کر گاڑی کی رفتار ساٹھ میل کر دی اور لہک لہک کر گانے لگا۔ "بنتو والک پتلا!"

میں نے دل میں سوچا۔ صرف بنتو کی کمر ہی پتلی نہیں ہے۔ آج اپنی قسمت بھی بالکل پتلی بلکہ نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتی ہے۔ کسی طرح اس ٹیکسی والے سے جان بچ جائے تو سائیں بابا کے قدموں میں گیارہ روپے کا چڑھاوا چڑھاؤں گا۔ یکایک بچن سنگھ نے گاڑی کی رفتار ایک دم ہلکی کر دی۔ حیرت کا ایک دوسرا جھٹکا مجھے لگا وہ میری طرف مڑ کر بولا۔ "آپ نے دیکھا؟"

"کیا؟"

"وہ اولڈ موبائیل جو پیچھے رہ گئی۔ اس میں؟"

"کیا تھا؟"

"تھا نہیں، تھی!"

"کیا تھی؟" میں نے بالکل غبی ہو کر پوچھا۔ ویسے بھی جھٹکے کھاتے کھاتے میرے ذہن میں اب موت کے سوا اور کسی شے کا تصور باقی نہ رہ گیا تھا۔

"لڑکی!" بچن سنگھ نے مجھے آنکھ مار کے کہا۔ "دیکھئے۔ وہ اب مجھے اوورٹیک کرے گی۔ غور سے دیکھئے۔"

میں نے غور سے دیکھا۔ ایک لڑکی تھی۔ ایک گاڑی تھی دونوں ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے

"عمدہ مال ہے۔" بچن سنگھ چٹخارا بھرتے ہوئے کہا "نئے ماڈل کی شیورلٹ معلوم ہوتی ہے!"

"تم گاڑی کے بارے میں بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تو لڑکی کے بارے میں بولتا ہوں۔" بچن سنگھ نے قہقہہ مار کے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ نے غور سے نہیں دیکھا۔ لیجئے میں آپ کو پھر دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر گاڑی کو ریس کر کے پھر آگے لے گیا۔ اب اس کی گاڑی لڑکی کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ لڑکی نے ایک لمحہ کے لئے سامنے سے نگاہ اُٹھا کر ہماری طرف اس نخوت سے دیکھا جیسے کوئی اعلیٰ نسل کی پومرین کُتیا گلی کے کتوں کی طرف دیکھتی ہے۔ پھر اس کی گاڑی آگے نکل گئی۔ "ہے نا فسٹ کلاس؟" بچن سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔

"ایک دم ہائی کلاس" میں نے اس کی تائید کی۔

"اس کے پیچھے چلیں؟" بچن سنگھ نے مجھے مشورہ دیا۔

"ارے نہیں بھائی۔" میں نے ایکدم گھبرا کر کہا۔ "مجھے تو ابھی اسمال کوز کورٹ پہنچنا ہے۔ ورنہ مالک مکان قرقی کرالے گا!"

بچن سنگھ نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "ابھی تو کورٹ کھلنے میں چالیس منٹ ہیں۔ جب تک تو ہم اس لڑکی کا گھر معلوم کر کے واپس بوری بندر پہنچ سکتے ہیں۔ ہمت کر جاؤ بابو!"

"ارے نہیں بھائی! تم سیدھے چلو اس وقت۔" میں نے بالکل زچ ہو کر کہا۔ "تمہیں لڑکی کی پڑی ہے، یہاں جان پر بنی ہے اور دیکھو۔ گاڑی آہستہ چلاؤ۔ بالکل آہستہ۔" میں نے کڑے لہجے میں کہا۔ "چاہے عدالت میں پانچ دس منٹ دیر سے پہنچیں گے مگر پہنچ تو جائیں گے۔"

بچن سنگھ کو میری بزدلی پر بیحد قلق ہوا۔ آہستہ سے سر ہلا کر بڑے افسوس سے بولا: "تمہاری مرضی سیٹھ، ورنہ ایسی لڑکی بمبئی میں تو اب کہیں نہیں ملے گی۔ میری ٹیکسی لے کر دس دن ڈھونڈو گے تو بھی نہیں ملے گی۔ کیا اسٹریم لائن باڈی ہے اس کا۔ کیا پالش ہے اس کا؟ ایک دفعہ اٹھا کر گیئر میں ڈالو تو یہاں سے نریمان پوائنٹ تک پیڑول کے بغیر چلتی چلی جائے۔۔۔۔"

"مجھے کسی لڑکی کا پیچھا نہیں کرنا ہے بچن سنگھ!" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "کسی طرح تم مجھے وقت پر اسمال کوز کورٹ پہنچا دو تو میں تمہیں دو روپے انعام دوں گا ورنہ ٹیکسی روک کر یہیں مجھے چھوڑ دو!"

"صاحب آپ کا نمک کھایا ہے کتنی بار ایسے کیسے چھوڑ دے گا آپ کو؟" بچن سنگھ نے اعتماد بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "آپ کو اسمال کوز کورٹ اور پھر کورٹ سے گھر چھوڑ کے آئے گا بھانڈوپ میں!"

"میں بھانڈوپ میں نہیں رہتا میں بھانڈوپ میں نہیں رہتا۔ میری سات پشتوں سے آج تک کوئی بھی بھانڈوپ میں نہیں رہا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

بچن سنگھ نے ایکدم میری طرف منہ موڑ لیا اور گاڑی کی رفتار تیز کر کے لڑکی کی گاڑی سے آگے نکل گیا اور بائی کلا کی طرف جاتے ہوئے اس نے درجنوں گاڑیاں، لاریاں، ٹرک گرد کی طرح پیچھے چھوڑ دیئے۔ ایک دفعہ بھی اس نے مڑ کر مجھ سے بات نہیں کی۔ اب وہ یقیناً مجھ سے خفا تھا اور میں اس سے بائی کلا کے قریب پہنچ کر میں نے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف نگاہ دوڑائی مگر مجھے کہیں ٹیکسی نظر نہ آئی۔ ورنہ میں فوراً اتر کر دوسری ٹیکسی لے لیتا۔ بدقسمتی سے اس وقت صبح کا وقت تھا۔ گویا دفتروں اور کارخانوں اور عدالتوں میں جانے کا وقت تھا۔ ایسے موقع پر دوسری ٹیکسی کہاں سے ملے گی؟ میں مایوس ہو کر اسی ٹیکسی کے اندر جلتا بھنتا ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

بائی کلا کے چوک پر بڑی بھیڑ تھی۔ ہماری ٹیکسی کے آگے گاڑیوں، لاریوں کا ایک اژدہام تھا۔ ایک طرف ٹرام کا پٹا تھا۔ دوسری طرف بیسٹ کی بسوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ بیچ میں راستے

کی پتلی سی ایک سرنگ بن گئی تھی۔ اتنی پتلی کہ اس میں سے کسی چھوٹی ٹیکسی کا گزرنا بھی مشکل تھا۔ چند منٹ تک تو بچن سنگھ آگے والی ٹیکسیوں اور گاڑیوں کو ہارن پر ہارن دیتا رہا اور اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کسمساتا رہا۔ پھر اس نے ایکدم بڑی پھرتی اور مشاقی سے گاڑی ذرا گھما کر اور لائن سے باہر نکل کے سرنگ کے اندر ڈال دی۔

میرے دونوں طرف، دائیں بائیں دیوزاد ٹرامیں اور بسیں خوفناک انداز میں گھڑگھڑاتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اس سرنگ میں ہماری ٹیکسی ایک چھوٹی سی چیونٹی کی طرح بھاگتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی ایک طرف ٹرام سے اور دوسری طرف بس سے بچ کر بھاگتے ہوئے ایسا لگتا تھا جیسے میری ٹیکسی میں اور ٹرام یا بس میں صرف چھ انچ کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ کوئی فاصلہ نہیں رہ گیا۔ اب ایکسیڈنٹ ہوگا۔ اب ایکسیڈنٹ ہوگا۔ خوف و دہشت سے میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے اور سارے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔

یکایک بچن سنگھ ایک وحشیانہ خوشی سے چلایا۔ وہ اس تنگ سی سرنگ سے اپنی ٹیکسی ثابت و سالم نکال کے لے آیا تھا اور ساری بسوں، ٹراموں اور ٹیکسیوں اور لاریوں سے آگے نکلتا ہوا لے جا رہا تھا۔

"دیکھا آپ نے؟" بچن سنگھ اپنی ساری خفگی بھول گیا اور فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ "دیکھا آپ نے؟"

میں نے تو دیکھا لیکن اُس نے نہیں دیکھا کہ بائیں طرف سے ریلوے انٹی ٹیوٹ کے اُوپر کے پُل سے ایک ٹرک بڑے زور سے گھوں گھوں کرتا سائیڈ سے چلا آ رہا ہے۔ میں نے چلا کر کہا۔ "اب بریک لگاؤ۔ بریک لگاؤ!" اور خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ لوگ مجھے ایک اسٹریچر پر لٹا کر اسپتال کے اندر لے جا رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ دوسرے اسٹریچر پر بچن سنگھ شدید زخمی حالت میں پڑا تھا۔ جگہ جگہ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر بولا۔ "بابو! تیری غلطی سے ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ اگر میں بریک نہ لگاتا تو صاف اپنی ٹیکسی لاری سے پہلے بھگا کر لے گیا ہوتا"۔ پھر اسپتال کے اردلیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "دیکھتے کیا ہو؟ تیز تیز چلو، دیکھتے نہیں ہو بابو کا اسٹریچر ہم کو اوور ٹیک کر رہا ہے؟"

ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی

جب سے فرنچ پرفیومرز لمیٹڈ نے چرچ گیٹ میں فرانسیسی عطروں کی دکان کھولی تھی بمبئی کے فورٹ کے علاقے میں اس کی گرلز کی دھوم مچ گئی تھی۔ فرنچ پرفیومرز لمیٹڈ کا مالک بلونت رائے ایک ہندوستانی تھا جو ایک عرصہ سے پیرس میں ہندوستانی مٹھائیاں بیچتا تھا وہیں پر اس نے ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کی تھی وہیں پر اس کے پانچ لڑکے پیدا ہوئے تھے پچیس برس کے بعد وہ اپنے وطن لوٹ آیا تھا، اپنی بیوی بچوں کے ہمراہ یہاں آکر بھی اس کا ارادہ اپنے پرانے پیشے کو جاری رکھنے کا تھا مگر اس کی بیوی مادام سوسنا نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی مٹھائیاں بیچنا غلط ہوگا، اگر وہ پیرس میں ہندوستانی مٹھائیاں بیچتا تھا تو اسی قاعدہ سے ہندوستان میں فرانسیسی عطر بیچنا چاہیئے، مادام سوسنا تجارت کے اصول بہت اچھی طرح سے سمجھتی تھی، اسے افسوس تھا کہ اس کی اولاد میں کوئی لڑکی نہ تھی جسے وہ عطر کی دکان پر سیلز گرل کا کام سکھا دیتی، اب لڑکوں کا عطر بیچنا ایسا ہی ہے جیسے بن کے آگے بھینس کا ناچنا اور وہ خود اپنی جوانی کا سرمایہ اپنے شوہر اور بچوں میں لگا چکی تھی، بس یہی ایک سرمایہ ہے، اس دُنیا میں جو سرمائے دار کو واپس نہیں لوٹتا ہے ورنہ ہمیشہ سود سمیت واپس ہوتا ہے۔ بلونت رائے اور مادام سوسنا نے بحالت مجبوری اخبار میں سیلز گرلز کے لئے اشتہار دیا تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں بہت جلد ایک اچھی لڑکی مل گئی، موہنی کراچی کی پیداوار تھی، سیدھے سبھاؤ کی معصوم لڑکی تھی۔ نہ کوئی غمزہ نہ ادا۔ دو چوٹیاں شانوں پر بکھراتے ایک سلیٹی رنگ کی ساڑی پہنے سیدھی کالج سے انٹرویو کے لئے آگئی تھی موہنی کا باپ مر چکا تھا۔ ماں گٹھیا سے نیم اپاہج بن چکی تھی، اس کے دو چھوٹے بھائی تھے جو بالترتیب پانچویں اور ساتویں میں پڑھتے تھے گھر میں سب سے بڑی وہ تھی اس لئے باپ کا جوا اس کے کندھے پر آپڑا تھا۔ وہ جیسے تیسے نباہ رہی تھی۔ صبح میں وہ کالج جاتی جو سات سے ساڑھے

دس بجے تک لگتا تھا۔ ہارن بی روڈ کے نکڑ پر واقع تھا اور دفتروں میں کام کرنے والے لوگوں کی سہولت کے لئے کھولا گیا تھا۔ دن میں دو جگہ پارٹ ٹائم ٹائپسٹ کا کام کرتی تھی۔ زندگی سخت تھی حالات نامساعد آرزوئیں مجبور دل بجھا بجھا سا، ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے جس نے اپنے ویرانہ ہستی میں دو چار نخلستان نہ سجا رکھے ہوں، مگر موہنی اپنی زندگی پر جدھر نظر ڈالتی۔ کوسوں تک اسے ریت ہی ریت نظر آتی کہیں کوئی پھول تو کیا گھاس کی پتی بھی نظر نہ آتی تھی۔ صرف اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں کبھی ایسے شفاف سائے لرزنے لگتے، جیسے بہت دور کہیں خواب رو رہے ہوں، صرف ان چند لمحوں میں اس کی ہستی بیحد دل آویز ہو جاتی تھی، اس وقت اگر کوئی اسے دیکھتا تو پتھر سے پنکھڑی پانی ہو جاتا، مگر بمبئی میں نہ پتھر دل ہوتا ہے نہ نرم دل ہوتا ہے، بمبئی میں دل کی جگہ ایک کلاک رکھا ہوتا ہے جو ہر وقت ٹک ٹک کیا کرتا ہے، اب کلاک بڑی اچھی چیز ہے بڑی کارآمد چیز ہے، مگر آپ کلاک سے محبت نہیں کر سکتے،

بلونت رائے موہنی کی بسورتی ہوئی صورت دیکھ کر اسے واپس بھیجنے والا تھا، مگر نجانے کیسے سوسنا نے موہنی کی بھوری بھوری آنکھوں میں وہ شفاف سے سائے تیرتے ہوئے دیکھ لئے اس نے ہاتھ کے اشارے سے موہنی کو جاتے ہوئے روک لیا اور اسے اپنے پاس بلا لیا۔

سوسنا حسن کا شدید احساس رکھتی تھی اس نے ایک نگاہ میں ہی موہنی کو پسند کر لیا، یہ لانبے لانبے سنہری رسوں کی طرح بٹی ہوئی چوٹیاں اگر کٹ جائیں اور بال پھیل کر شانوں پر بکھر جائیں تو کیا ہوگا۔

یہ سیدھی صف آرا پلکیں اگر ذرا گھوم کر رخسار سے دمکتے ہوئے رخساروں پر حجاب آمیز ادا سے گر جائیں تو کیا ہو؟

"یہ پختہ بھیگا بھیگا ذہن اگر شافری کی لپ اسٹک سے آشنا ہو جائے وہ لپ اسٹک جو لبوں پر گھومتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ ہونٹ شعلوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں وہ لپ اسٹک اگر ہونٹوں سے مس ہو جائے تو کیا ہو؟"

"جھاگ والے ربڑ کے نئے فٹنین کی انگیا ذرا اوپر کو اٹھتی ہوئی وہ بے باک اٹھان نہیں

جیسے آج کل عورتیں فیشن کی معراج سمجھتی ہیں بلکہ وہ جھجکتی ہوئی متین سی اٹھان جیسے کنواری ایک نگاہ اوپر اُٹھائے دیکھ لے۔

کمر کس کے اندر سے باندھی ہوئی ... . حالانکہ اس کی ضرورت نہ پڑیگی، اس کے چھریرے لانبے بدن کی کمر یقیناً فرانسیسی عطر کی طرح نازک ہوگی۔

نہیں وہ اسے ساڑی نہیں دیگی وہ اسے فرانسیسی گون پہنائے گی، سائے اور گون اور سلیکس اور جینز، اس سیلزگرل کے طرح طرح کے لباس ہوں گے، وہ اسے فرانسیسی عورتوں کے بہترین لباس دیگی، عطر کی عورت کا لباس بھی بدلنا چاہیئے، صبح میں کچھ اور سہ پہر میں کچھ اور شام میں کچھ اور .... وہ اس کے لئے کم سے کم پچیس لباس سلوائے گی۔

مادام سوسنا نے چند لمحوں ہی میں سب سوچ لیا اور اس نے بڑے پیار سے موہنی کو اپنے پاس بٹھالیا اور بولی۔

"تمہارا پرابلم کیا ہے؟ تم اتنی اُداس اور اُجڑی اُجڑی سی کیوں ہو؟"

فرانسیسی عورت بہترین محبوبہ ہے لیکن اگر وہ ماں بننا چاہتی ہے تو اس سے بہترین ماں کا تصور نہیں ہو سکتا، اس کی میٹھی شہد آگیں آواز کو سُن کر موہنی پگھل گئی روتے روتے اس نے اپنی زندگی کی ساری داستان سنادی داستان میں تھا ہی کیا چند منٹ میں ختم ہو گئی۔

"چار سو روپے میں تمہارا کام چل جائے گا؟" سوسنا نے اس کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میڈم"! موہنی حیرت اور خوشی سے تقریباً چیخ کر بولی۔

"سوسنا؟" بلونت رائے بھی حیرت سے چیخا، مگر اس کی آواز میں خوشی بالکل نہ تھی۔

"چپکے بیٹھو۔" مادام نے اپنے شوہر کو ڈانٹ دیا۔ "تم نہیں جانتے یہاں ہم ہندوستانی مٹھائی نہیں بیچ رہے ہیں، فرانسیسی عطر بیچ رہے ہیں، چار سو روپے مہینہ بھی اس لڑکی کے لئے بہت کم ہے۔ تم اس کا پرابلم نہ دیکھو۔"

"او کھنیں"! بلونت رائے کسی زمانے میں جالندھر کا مشہور پہلوان ہوا کرتا تھا، اس کی

شہرت کا راز یہ تھا کہ بڑے سے بڑے پہلوانوں سے ٹکر لینے کے لئے راضی ہو جاتا، مگر ہمیشہ ہارتا تھا اور جب چاروں شانے چت گرتا تھا، تو بڑی مایوسی سے چلا کر اپنے آپ کو کہتا تھا، "او بھینس"

وہ پیرس اپنی پہلوانی کے کرتب دکھانے گیا تھا اور جب چاروں شانے چت گر گیا۔ جب سے اس نے کشتی چھوڑ کر ہندوستانی مٹھائی بیچنے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

سوسنا نے موہنی سے پوچھا۔ "خوشبوؤں کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

"میں نے آج تک کبھی کوئی خوشبو نہیں لگائی"، موہنی نے ڈرتے ڈرتے اقبال جرم کیا۔

سوسنا بیحد خوش ہو کر بولی۔ "تب تو بہت اچھا ہے بہت مشکل ہوتا ہے"

"او بھینس"، بلونت رائے۔ پھر بڑی مایوسی سے بولا۔ اُسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اب تک اس نے جو کچھ ہندوستانی مٹھائی سے کمایا ہے اب وہ سب فرانسیسی عطر میں غارت ہو گا۔

"شٹ اپ"، سوسنا اسے دھمکاتے ہوئے بولی۔

بلونت رائے فوراً شٹ اپ ہو گیا۔

"میں دو ماہ کے لئے تم کو گھر پر ٹریننگ دوں گی"، سوسنا موہنی سے بولی۔ "دو ماہ کے بعد تم دکان پر کام کرنے لگو گی۔ دکان پر پہننے کے لئے کپڑے ہم دیں گے، لنچ کا خرچ ہمارا ہو گا، دکان بند ہوتے ہی تم شام کے لباس میں میرے گھر پر آؤ گی اور یہاں سے اپنا لباس تبدیل کر کے اپنے گھر جایا کرو گی۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"گھوکھر ابلڈنگ، آٹھ نمبر کھولی، ناگپاڑہ"

سوسنا نے اس کا ایڈریس لکھ لیا۔

ناگپاڑہ کا نام سنتے ہی بلونت رائے کو ایسا محسوس ہوا جیسے بہت سی بدبوئیں اس کی ناک میں گھس آئی ہوں۔ مگر وہ چپ رہا کیونکہ اسے اس کی بیوی نے شٹ اپ کر دیا تھا اور وہ ایک وفادار خاوند تھا۔

سوسنا نے موہنی کے ہاتھ میں اپنا کارڈ دیکھ کہا۔

"یہ ہمارے گھر کا پتہ ہے"

موہنی نے ایک نظر کارڈ پر ڈالی۔

گیارہ نمبر وارڈن روڈ۔

اور پھر اس کارڈ کو اپنی انگیا میں ڈال کر چلی گئی۔

دو ماہ بعد جب چرچ گیٹ کے نکڑ پر روز اینڈ روز کمپنی پرفیومرز لمیٹڈ کی دکان کھلی تو سارے علاقے میں فرانسیسی خوشبوؤں کی دھوم مچ گئی، کولابے سے کف پریڈ سے، وارڈن روڈ سے میرین ڈرائیو سے، کمبالا ہل سے جوق در جوق لوگ فرانسیسی عطر خریدنے کے لئے آنے لگے، بعض من چلے دن میں دو دو مرتبہ عطر خریدنے کے لئے جاتے تھے

اور موہنی.....

موہنی کو اب کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ وہی کمرشیل کالج میں پڑھنے والی کبھی کبھی سی سندھی لڑکی ہے، موہنی کے چمکتے ہوئے سنہرے بال تار عنکبوت کی طرح نان بان، اس کے شعلے کی طرح بھڑکتے ہوئے ہونٹ، اور ان ہونٹوں کے اندر بید سپید اور متناسب دانت اس کی بھوری بھوری شفاف ہوئی آنکھیں، وہ چال ہندوستانی عورت کا سارا اعتماد لئے ہوئے اس کے فریخ گاؤن، اس کا خوبصورت پرس اس کے ارد گرد پھولوں کی طرح عطر بیز مہک، متمول ترین علاقوں کی فیشن ایبل عورتیں، اس کے گاؤن دیکھنے آتی تھیں آج اس نے کون سا گاؤن پہن رکھا ہے؟ کون سا پرس سنبھالے ہوتے ہے؟۔ کون سی خوشبو لگا رکھی ہے؟ میک اپ کا انداز کیا ہے؟۔ عورتیں اُسے دیکھ کر پاگل ہونے لگتیں اور مرد پاگل ہو کر اسے دیکھتے۔

اور موہنی کی زبان کیا چلتی تھی، وہ کم گو متین ہندوستانی لڑکی اب ایک لمحہ چُپ نہ رہتی کیونکہ اسے مادام نے بتا دیا تھا کہ چُپ رہیں تو تمہاری باتوں کی ساری خوشبو اڑ جائے گی، عطر بیچنا ہے تو گاہک کو ہر لحاظ سے باتوں میں اُلجھاتے رکھو، ایک کے بعد دوسرا عطر پیش کرتی جاؤ۔ عورتیں پچاس عطروں میں ایک عطر کا انتخاب کرتی ہیں مردوں کے لئے اپنا سارا زور صرف ایک عطر بیچنے میں لگا دو۔

جب درشن نے اسے دیکھا تو وہ کاؤنٹر پر مودّب کھڑے ہائی سوسائٹی کی مشہور شوشلائٹ مس خورشید ابٹن والا کے سامنے عطر کی مختلف شیشیاں رکھے اس سے گفتگو میں مصروف تھی۔

,, خوشبو کا راز اس بات میں ہے مس ابٹن والا کہ صحیح خوشبو خریدی جائے، اور صرف وہ خوشبو خریدی جائے جس کی شخصیت خریدنے والی کی خوشبو سے مطابقت رکھتی ہو۔''

,, خوشبو کی شخصیت ہوتی ہے!۔ موہنی،، خورشید ابٹن والا ہنس کر بولیں۔

,, ہاں مس ابٹن والا ہر خوشبو کی اپنی شخصیت ہوتی ہے اپنی ایک صورت ہوتی ہے اس کا قد ہوتا ہے، رنگ ہوتا ہے، اب مثال کے طور پر گلاب کے عطر کو لے لو، گلاب کی خوشبو کے ہونٹ ذرا سونگھ کر دیکھئے نا...... اس گلاب کی خوشبو کے ہونٹ کیسے سُرخ اور گلاب سے بھرپور بالکل آپ کے ہونٹوں کی طرح ہر وقت کسی نامعلوم جذبے سے تھرتھراتے ہوئے......''

مس خورشید ابٹن والا بے اختیار خوش ہو کر ہنسیں۔

,, یہ چنبیلی کی خوشبو دیکھئے، ذرا ملاحظہ فرمائیے کیسی کم عمر، نوخیز چھریرے بدن والی نازک کمر والی خوشبو ہے، اپنے مستانہ خرام سے دلوں پر بجلیاں گرائے چلی جاتی ہے۔''

,, یہ پیرس کی رات، دراز قد، سیاہ گیسو پھیلائے ہوئے اپنے نرم گال آپ کے گالوں سے یوں لگا دیتی ہے کہ گال اور گیسو کے لمس سے آپ کے جسم میں گدگدیوں کے بلبلے سے پھوٹنے لگتے ہیں۔ یہ جوہی کی کنواری خوشبو، پاکیزہ سمٹی سمٹائی، چور نگاہوں سے آپ کے دل پر حملہ کرتی ہوئی کبھی ایک قدم پیچھے ہٹتی ہوئی اس کی مہک ایک شرمیلی دوشیزہ کی طرح پُر حجاب نظر آتی ہے۔

یہ سنگھدراج کی خوشبو، گوری گوری رنگت والی نتھری صبح اور روشن خوشبو۔ بالکل آپ کے چہرے کی طرح مس ابٹن والا اسے نہا کر ذرا سا جسم پر لگا دیجئے۔ ایسا معلوم ہوگا گویا ادشا بادلوں میں دُھل کر باہر نکل آئی ہے۔

نہ صرف یہ خوشبو کی اپنی شخصیت ہوتی ہے اس کا اپنا ایک لباس بھی ہوتا ہے۔ جو احساس میں کبھی تو ریشم کی طرح سرسراتا ہے کبھی کبھی نائلان کی طرح پھسلتا ہے کبھی

شفاف کی طرح لپٹا جاتا ہے۔

اس لئے میڈم دُنیا میں جو بھی سلیقہ شعار عورتیں ہیں، ہمیشہ کسی عمدہ خوشبو کا سہارا لیتی ہیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ لباس کے حسن کی طرح خوشبو کا حُسن بھی مستعار لیتی ہیں۔ چند لمحوں کے لئے خوشبو کا حُسن عورت کے حُسن پر چھا جاتا ہے، اور مرد سمجھتا ہے کہ عورت حسین ہے۔

"حالانکہ صرف خوشبو حسین ہے"!

یہ آخری چوٹ مادام سوسانے خاص طور پر موہنا کو رٹائی تھی، عورتیں بڑی بر خود غلط ہوتی ہیں، ان کے حسن کی تعریف کرو، ضرور کرو، وہ اس سے خوش ہوتی ہیں، ———— ———— مگر کہیں پر ان کے اندر ایک لمحہ کے لئے احساسِ کمتری پیدا کر دو کہ جس کی چوٹ کھا کر وہ تمہارے عطر کو اپنے حسن کے لئے ضروری خیال کریں، ورنہ وہ تمہارا عطر کیوں خریدیں گی عورت بڑی پریکٹیکل ہوتی ہے، موہنی!

مس اپٹن والا وہ خوشبو خرید لے گئی، روز جس کے ہونٹ موہنی کے الفاظ میں مس اپٹن والا کے ہونٹوں سے شباہت رکھتے تھے (حالانکہ نہیں رکھتے تھے) اور سنگھ راج ..... جس کی رنگت خورشید اپٹن والا کی رنگت سے ملتی جلتی تھی، ایک سو ستر روپے کا بل ہوا۔ حالانکہ بھنڈی بازار والے عطر فروش یہی دونوں خوشبوئیں دس پندرہ روپے میں دے دیتے، مگر وہ بھی کمبخت کیا عطر بیچتے تھے۔ لوہے کی ایک پتلی سی سلائی پر روئی کے پھاہے میں عطر لگا عطر بیچتے تھے جیسے وہ عطر نہ بیچ رہے ہوں کانوں سے میل نکال رہے ہوں، درشن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل کے وائلن کے سارے تار چھیڑ دیئے وہ موہنی کو بھونچکا دیکھتا ہی رہ گیا اور جب مس اپٹن والا کے چلے جانے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

"فرمائیے! آپ کو کون سا عطر چاہیئے؟"

تو وہ بید گڑبڑا گیا، وہ تو محض اسے دیکھنے کے لئے دکان کے اندر آ گیا تھا، بے اختیار اس

کے مدہوش کر دینے والے حسن سے کھنچا ہوا اندر آگیا تھا۔ اب یہ لڑکی اس سے کیا پوچھ رہی تھی، وہ بیحد گڑبڑا کر بولا۔

"جی؟"

جیسے اسے کچھ خریدنا ہو، خریدنا موہنی کو ہو۔

"کوئی عطر دکھاؤں یا وڈی کلون؟"

ہم نے پیرس سے نئے روڈی کلون منگائے ہیں، یہ سین کی وادیوں کے پھول کے اصلی روڈی کلون ہیں۔ یہ صبح کے وقت نہا دھو کر استعمال کرنے والا روڈی کلون..... یہ دوپہر کی گرمی کی تمازت دور کرنے والا روڈی کلون، یہ کام سے فارغ ہونے کے بعد چہل قدمی کے لئے جانے سے پہلے استعمال کرنے والا روڈی کلون، یہ رات کے ڈانس میں جانے سے پہلے برتنے والا روڈی کلون، مکمل سیٹ ایک سو گیارہ روپے کا ہے، سین کی وادیوں میں مہکنے والا پھولوں کا اصلی روڈی کلون....."

"جی.... جی.... مجھے کچھ نہیں چاہیئے..." درشن نے شرما کر کہا اور اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔

"میں تو صرف آپ کو دیکھنے کے لئے آیا تھا، دفتر میں بہت لوگوں نے....."

موہنی نے حجاب آمیز نگاہوں سے اپنی پلکیں جھکا لیں، بالکل اس طرح جس طرح اس موقع کے لئے مادام نے بتایا تھا، دوسری بار جب اس نے پلکیں اٹھائیں تو درشن وہاں سے جا چکا تھا، موہنی کے دل کو ایک عجیب سا دھچکا لگا، مرد تو بہت آتے تھے دکان پر، مگر ان میں سے بیشتر بے ایمان تھے، آتے تھے اسے دیکھنے کے لئے، لے کے جاتے تھے عطر اور خوشبو اور روڈی کلون، ہیئر آئل شمپو اور کریم،

مگر یہ کیسا لڑکا تھا، شرما بھی گیا اور بے جھجک سب کچھ کہہ بھی گیا، پھر کچھ خرید کر بھی نہ لے گیا، شاید وہ کچھ خریدنے نہ آیا تھا کچھ دینے آیا تھا، شام تک موہنی کو اپنا دل کچھ خالی خالی سا لگنے لگا، جیسے اس کی ساری دکان لوٹی جا چکی ہے، کسی نے اس کے دریچے میں جھانک کر وہاں کے سارے

عطر چرا لئے ہیں۔

اونہہ! موہنی نے اپنے سر کے بالوں کو جھٹک دیا۔ اسے اس طرح کی باتیں نہیں سوچنا چاہیئے، مادام نے اسے خبردار کر دیا تھا، سب کچھ ہوگا مگر عشق نہیں ہوگا، لوگ تمہیں گھومنے کے لئے بلائیں گے، مگر تم کہیں جاؤ گی نہیں، لوگ تمہیں پارٹیوں میں مدعو کریں گے چائے کی دعوت دیں گے ـ ذرا دو منٹ کے لئے تخلیہ چاہیں گے، مگر تم ہمیشہ انکار کر دو گی کیونکہ تم عطر بیچنے والی ہو۔ عطر اور محبت میں بھی فرق ہے، عطر ذرا سی دیر کے لئے مہکتا ہے پھر اڑ جاتا ہے، محبت اگر ساتھ لپٹ جائے تو زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتی، اگر عطر بیچنا چاہتی ہو تو اس چکر میں مت پڑنا۔

شام کے ساڑھے چھ بجے مادام سوسنا کی گاڑی اسے لینے کے لئے دوکان کے باہر آ پہنچی، پہلے تو موہنی نے اندر جا کر باتھ روم میں اپنا میک اپ ٹھیک کیا۔ بالوں کو سنوارا، شام کا خوبصورت لباس پہنا۔ یہ لباس پہننا بے حد ضروری تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ باہر شوقین مزاج نوجوانوں اور رئیس زادوں کی لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی ہوں گی، سب اسے دیکھنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت اسے دکان سے ایک پراسرار شہزادی کی طرح حسین اور دور افتادہ بن کر نکلنا ہوگا، وہ بڑی تمکنت سے باتھ روم سے باہر نکلی۔ بلونت رائے کو اس نے سر کی جنبش سے سلام کیا اور پھر برس جھلاتی ہوئی باہر آ گئی، ڈرائیور نے سلوٹ مار کر اس کے لئے کار کا دروازہ کھولا، تماشائیوں کی نظریں اس پر گڑ گئیں ہ سیٹیاں بجیں، کچھ ہائے وائے ہوئی، کچھ چنگاریاں لپکیں، کچھ آہیں بھڑکیں، پھر گاڑی وارڈن روڈ کی جانب چلی گئی۔

بھیڑ میں درشن بھی کہیں چھپا کھڑا تھا، موہنی کو اس لباس فاخرہ میں نکلتے دیکھ کر اس کا ہ فق ہوگیا، کیسی غلطی کی اس نے جو وہ اس سیلز گرل کو دل دے بیٹھا یہ تو جانے مالابار ہل یا وارڈن روڈ کی کوئی شہزادی ہے جو کار میں بیٹھ کے آتی ہے، کار میں جاتی ہے جس کے گاؤن پیرس سے سل کر آتے ہیں، جس کے بال "تاج" میں ڈھلتے ہیں اور جس کا جسم نیویارک کے میک اپ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس نے تو شاید شغل کے طور پر عطر بیچنے کا کام اختیار کر لیا ہے، اسے بھول جاؤ۔ آرام سے

اپنی فرم میں ڈھائی سو روپے کی ملازمت کرتا جا اور اگر عشق کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ تیرے دفتر میں مس ڈی سوزا کیا بُری ہے، ڈیڑھ سو روپے ماہوار لیتی ہے بار بار تیری میز پر آ کر جھک جاتی ہے اور اپنا نیم عریاں سینہ دکھا کر چلی جاتی ہے۔ شفان کا خیال چھوڑ دے اپنی کاٹن کی کھال میں مست رہ"

مگر درشن سے رہا نہیں گیا، دوسرے دن وہ پھر فرنچ پرفیومرز کی دکان پر آ گیا، تیسرے دن بھی گیا، چوتھے دن بھی گیا، پانچویں دن بھی گیا، ہر روز وہ شیو کرنے کے بعد استعمال کرنے والا روڈی کلون دس روپے میں خرید لیتا تھا اور کچھ نہیں کہتا تھا، بس وہی ایک روڈی کلون خریدتا اور خرید کر باہر چلا آتا.... نہ وہ مسکراتا تھا نہ کوئی بات کرتا تھا۔

چھٹے دن موہنی نے کہا۔ "روڈی کلون کی کتنی شیشیاں خریدو گے"

"پچیس"

"پچیس کیوں؟"

"بات یہ ہے" درشن نے اسے نہایت سادگی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میری تنخواہ ڈھائی سو روپے ہے، میں اس تنخواہ سے روڈی کلون کی صرف پچیس شیشیاں خرید سکتا ہوں اس لئے ہر روز میں ایک شیشی خرید کے لے جاتا ہوں، پچیس دن تک خریدتا رہوں گا پھر پانچ دن نہیں آؤں گا۔

پھر یکم کو آؤں گا۔

اور یکم سے پچیس تک آتا رہوں گا.....!

"کتنے سال کا پلان ہے؟" موہنی نے شوخی سے پوچھا۔

کہہ نہیں سکتا، جب تک جیب ساتھ دے یا قرضہ ملتا رہے یا کوئی دوسرا پارٹ ٹائم جاب ملتا رہے۔

جب تین مہینے اسی طرح گزر گئے تو موہنی کو سخت وحشت سی ہونے لگی۔

مگر یہ تو سخت حماقت ہے، مسٹر!"

" درشن میرا نام ہے"، میں جانتا ہوں یہ ایک حماقت ہے کہاں تم وارڈن روڈ پر رہنے والی شہزادی، کہاں میں ایک معمولی فرم کا کام کرنے والا کلرک، تمہارا خیال ہے، میں جانتا نہیں ہوں میں کیا کر رہا ہوں، مجھے بڑی مصیبت اُٹھانی پڑتی ہے راتوں کو چار چار گھنٹے اکسٹرا کام کرنا پڑتا ہے، انگلیاں دُکھ جاتی ہیں مگر...... یکایک وہ چُپ ہو گیا۔

موہنی کا دل دھڑکنے لگا آہستہ سے بولی۔ "مگر کیا....؟"

" کچھ نہیں، ذرا وہ میری روڈی کلون دیدو۔"

روڈی کلون لینے موہنی مڑ ہی رہی تھی کہ اتنے میں ایک گھوڑے کے چہرے اور گھوڑے کے سے دانتوں والی ایک انگریز عورت بڑی گھبرائی ہوئی سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے داخل ہوئی۔

موہنی فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

" مجھے خوشبو چاہیئے۔"

" کیسی مادام؟"

" کیسی بھی دیدو، کوئی اچھی سی خوشبو ہو، میں نے سُنا ہے کہ تمہاری دکان سے بہتر خوشبو بمبئی میں کہیں نہیں ملتی ہے، اس لئے میں نے سوچا، اس مصیبت میں تمہارے سوا اور کس کے پاس جاؤں۔"

" تھینک یو مادام..... تھینک یو......" مجھے آپ کی مصیبت میں آپ سے بڑی ہمدردی ہے اور آپ کا یہ ماتمی لباس دیکھ کر میں خود سوچ رہی ہوں کہ آپ کو کون سی خوشبو دوں۔

" شاید آپ کا کوئی عزیز......"

" عزیز نہیں گھوڑا مارکہ انگریز عورت فیصلہ کن لہجے میں بولی۔" میری زندگی کا سب سے عزیز، سب سے چہیتا سب سے پیارا مجھے داغ مفارقت دے گیا ہے میرا ٹونی۔"

" گوڈ ہیونس...... ٹونی میرا کتا...."

" اوہو معاف کرنا مادام، مجھ سے بھول ہوئی، دراصل اتنے سوال کرنے کی اس لئے

ضرورت پڑی کہ ماتمی خوشبوئیں بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں۔"

محبوب کے مرنے پر ایک خوشبو لگائی جاتی ہے، کتے کے مرنے پر دوسری، شوہر کے مرنے پر تیسری، بچے کے مرنے پر چوتھی ہمارے ہاں ماتمی خوشبوؤں کی الگ الگ قسمیں ہیں آپ یہ خوشبو لے جائیے، سٹونی ہارٹ!"

"سٹونی ہارٹ؟"

جی ہاں دیکھئے اور اس کا نام بھی کس قدر آپ کے کتے سے ملتا جلتا ہے، ٹونی ہارٹ اور سٹونی ہارٹ میں کس قدر کم فرق ہے؟ معلوم ہوتا ہے یہ خوشبو صرف آپ کے کتے کے ماتم کے لئے بنائی گئی ہے۔"

"سٹونی ہارٹ واقعی۔" انگریز عورت پرس کھولتے ہوئے بولی۔ "واقعی وہ پتھر دل کتا تھا، مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔

انگریز عورت کے لہجے میں آنسوؤں کا ہلکا سا اشارہ تھا پرس کھول کر بولی۔ "کتنے پیسے ہوں گے؟"

"صرف ساٹھ روپے!" موہنی نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"صرف ساٹھ روپے،" انگریز عورت ذرا متجسس ہو کر بولی۔

"مگر تم ٹھیک کہتی ہو، یہ خوشبو بہت عمدہ ہے، بوجھل..... بوجھل اُداس سی اور کچھ کھردری سی خوشبو، بالکل میرے ٹونی کے بھورے اور خشک بالوں کی طرح، میں اس کو لے جاؤں گی اس سے مجھے اپنا ٹونی یاد آئے گا۔ تھینک یو ویری مچ۔"

"ساٹھ روپے دیکر جب انگریز عورت چلی گئی، تو موہنی نے معافی مانگتے ہوئے درشن کو روڈی کلون کی نئی شیشی لا دی۔"

"سوری آپ کو انتظار کرنا پڑا۔"

"نہیں، بلکہ مجھے تو زیادہ وقت مل گیا۔"

موہنی خاموش کھڑی رہی۔

"چلتے چلتے درشن نے کہا۔ "گو ڈبائی سٹونی ہارٹ!" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

موہنی کا دل لرزنے لگا.....

نہیں، نہیں، میں عشق نوکری نہیں سکتی، مجھے کوئی حق بھی نہیں ہے۔ اتنی اچھی چار سو کی نوکری مجھے کہاں ملے گی، ان چار سو روپوں میں میری ماں کا علاج ہو رہا ہے، میں اپنی اندھی خالہ کو پیسے بھیجتی ہوں، میرے دونوں بھائیوں کی تعلیم انگریزی اسکول میں پوری ہو سکتی ہے۔ مجھے یوں رہنا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر درشن بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح ہوتا جو اسے دیکھنے کے لئے دکان میں آتے تھے اور اس سے طرح طرح کے مذاق کرتے تھے۔ شستہ مذاق، مخمل میں لپٹے ہوئے مذاق مگر ایسے مذاق جن کے اندر غلیظ خواہش کی تیز چھری چھپی رہتی تھی، جس کی دھار کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے عیاں بھی ہو جاتی تھی، امیر طبقے کے شہزادے، ملوں کے ہونے والے مالک، ٹھیکہ داروں کے سپوت، رشوت لینے والے افسروں کے صاحبزادے، گلیمر کے ہالے میں دمکتے ہوئے ماہتاب کی طرح خوبصورت فلمی ہیرو، جو ایک رات میں بیس ہزار روپے پھونک سکتے تھے، وہ سب اس کی ایک نگاہِ ناز کے متمنی تھے مگر صرف ایک نگاہِ ناز کے وہ کوئی عمر بھر کا پیمان باندھنے کے لئے نہیں آتے تھے، جیسے وہ عطر خریدنے آتے تھے اور عورت کی آب بھی اسی وقت تک ہے جب تک وہ اپنی عزت کی شیشی میں محفوظ ہے، عطر کی شیشی کھلی اور آب غائب، یہ مردوں کی دنیا ہے اس میں عورت اور عطر ہمیشہ بدلے جاتے ہیں۔ مادام نے اسی طرح سے سمجھایا تھا۔

مگر پھر بھی درشن اسے اس طرح نہیں لگتا، کوئی اس کے دل کے اندر بولتا تھا اور کہتا تھا یہ تو ایسا نہیں ہے، وہ تو کچھ کہتا بھی نہیں ہے، کوئی مخمل میں لپٹا ہوا گندا مذاق نہیں کرتا، اس کی آنکھوں میں کیسی شرافت ہے، کیسی وارفتگی ہے، دل و جان سے چاہنے کی کیسی آرزو ہے اس کے پریشان بالوں کی لٹ اسے اس قدر پیاری کیوں معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اسے اپنے سینے سے لپٹا لے، دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر آنکھیں بند کر کے اسے اپنی ہی چھاتی

سے لگالے۔

ہائے یہ کیسی خواہش ہے جو میری جان کو کھائے جاتی ہے۔ مگر..... مگر..... نہیں.... مجھے اس طرح سوچنے کا کوئی حق نہیں ہے، وہ تو مجھے آسمانوں پر اُڑنے والی شہزادی سمجھتا ہے میں اس کا سندر سپنا کیوں چُور کردوں، اس نے تو ہمیشہ مجھے فرانسیسی گاؤن میں دیکھا ہے، خوشبوؤں میں لپٹا ہوا زرکار پرس جھلاتے ہوئے مادام کی گاڑی میں دیکھا ہے، اسے کیا معلوم میں ایک بدبخت لڑکی ہوں۔

ناگپاڑے کی ایک گندی چال میں ایک بدبودار کوٹھری میں اپنے دو دنوں بھائیوں اور گھٹیا کی ماری ہوئی ماں کے ساتھ رہنے والی جسے ہر ماہ سو روپے اپنی اندھی خالہ کو دینے پڑتے ہیں اگر اسے حقیقت معلوم ہو جائے، تو کیا وہ مجھ سے پریم کرسکے گا۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، اچھا ہے یہ دھوکا یونہی رہے، مگر اس کا اس طرح سے آکر اپنے آپ کو لٹانا تو مجھے اچھا نہیں لگتا، بالکل غلط ہے بالکل غلط ہے، مجھے اس سے سرد مہری کا سلوک کرنا چاہیئے۔ ایسا سلوک جس سے اس کے دل میں میرے لئے نفرت کی آگ بھڑک اُٹھے، وہ مجھ سے شدید نفرت کرنے لگے، مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جائے اور اگر یاد بھی کرے تو ایک بُری ناکارہ بدمعاش آوارہ لڑکی کی طرح.....

جس دن موہنی نے یہ فیصلہ کیا اس دن وہ بیحد اداس اور تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی، اور مادام نے اس کے زرد زرد اُڑے اُڑے چہرے کی رنگت کو دیکھ کر اس کی طرف اشارہ بھی کیا، مگر موہنی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اسے آج بہت کام کرنا پڑا ہے۔

گاہکی بہت زیادہ تھی اور وہ بیحد تھکی ہوئی تھی۔

گاؤن اتار کے اس نے اپنی سادہ ہینڈلوم کی ساڑھی پہن لی اور پرانے سینڈل کھٹکھٹاتی ہوئی موہنی وارڈن کے عالیشان فلیٹ سے اُتر کر ایک بس میں سوار ہو کر اپنے گھر ناگپاڑے چلی گئی۔

موہنی کے پلان کا شروع میں تو خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ درشن بھی بیحد ڈھیٹ تھا مگر موہنی نے

سوچ لیا تھا کہ وہ بھی ڈھٹائی کا جواب مکمل ڈھٹائی سے دیگی یہ قصہ اس کی ہمت چوپٹ کر رہا تھا اس کے کام میں حارج ہو رہا تھا، اس کی راتوں کی نیند حرام کر رہا تھا۔ اب اس قصے کو ختم ہو جانا چاہیئے، جس قصے کا کوئی خاطر خواہ انجام نظر میں نہ ہو اسے ڈھیل دینے سے کیا فائدہ۔

اب درشن کو دیکھتے ہی موہنی تیوری سی چڑھا لیتی، وہ اس کے لئے روڈی کلون کی شیشی بل کاٹ کے الگ سے تیار رکھتی۔

درشن آتا، موہنی اس کے ہاتھ میں بل اور شیشی تھما دیتی اور تھینک یو کہہ کے دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو جاتی اس پر بھی درشن باقاعدگی سے آتا رہا، وہ کچھ بجھ سا گیا تھا، مگر وہ پھر بھی آتا رہا۔

خیر ایک دن موہنی کو آخری حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور موقع کی وہ تلاش میں ہی تھی، اس روز گروپ کیپٹن لال کا کا اس کے قریب کھڑا اس سے عطریات کے فن پر بحث کر رہا تھا۔

گروپ کیپٹن لال کا کا دوسری جنگ عظیم کا نامور ہوا باز تھا۔ وہ آرمی سے ریٹائر ہو چکا تھا اور ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا، چالیس برس کی عمر میں بھی وہ بڑی مشکل سے تیس کا دکھائی دیتا تھا، اس کا گورا رنگ جیسا کہ پارسیوں کا عموماً ہوتا ہے۔ اس کے گھومے ہوتے بال مضبوط ٹھوڑی اور چھوٹی چھوٹی پُروقار مونچھیں اس کے چہرے کو عجیب وجاہت عطا کرتی تھیں۔ وہ بڑا بانکا اور سجیلا تھا اور ہائی سوسائٹی کی خوبصورت لڑکیوں میں وہ قاتل کے نام سے مشہور تھا، لڑکیاں تو اس کے ذرا سے لنگڑانے پر بھی جان دیتی تھیں، بولتے بولتے اس کی زبان میں کسی وقت جو ذرا سی لکنت پیدا ہوتی تھی اسے بھی لڑکیاں بیحد پسند کرتی تھیں، گروپ کیپٹن لال کا کا چار سال پیرس میں رہ چکا تھا اس لئے اسے فرانسیسی عطریات سے بڑی دلچسپی تھی کیونکہ فرانسیسی لڑکیوں کے نفسیات میں عطر کو بہت دخل تھا اس لئے ہر سمجھدار نوجوان کے لئے جو عورتوں میں مقبول ہونا چاہتا ہے اس کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ عطر کے بارے میں بھی تھوڑی سی واقفیت رکھتا ہو۔

گروپ کیپٹن لال کا کا اکثر فرنچ پرفیومرز سے عطر خریدنے آیا کرتا تھا اور موہنی سے باتیں

کرنے میں اسے بڑا لطف آتا تھا، اس وقت بھی وہ موہنی سے باتیں کر رہا تھا جب درشن دکان کے اندر داخل ہوا، موہنی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی، وہ گروپ کیپٹن لال کاکا سے باتیں کرتی رہی۔

موہنی ہنس کر بولی۔

"کیپٹن لال کاکا..... عطر کا بھی ایک وقت ہوتا ہے، ایک ماحول ہوتا ہے، لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں نہ وقت دیکھتے ہیں نہ ماحول کا خیال کرتے ہیں۔

درشن کا رنگ فق ہو گیا۔

گروپ کیپٹن لال کاکا نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

مثال کے طور پر میں نے اس وقت جو خوشبو لگا رکھی ہے اس کے متعلق تم کیا کہو گی۔

موہنی گروپ کیپٹن کے سینے کی طرف جھکی اور جھکی، اس کے بال گروپ کیپٹن کی ٹھوڑی سے چھو گئے، درشن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے کلیجے میں چھری بھونک دی، وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

میں تمہیں اس عطر کا نام تک بتا سکتی ہوں اور یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ کب تم نے اسے لگایا تھا۔

"کب؟"

"تقریباً دو گھنٹے ہوئے ہیں۔"

"درست"

"اس عطر کا نام آخری بوسہ ہے۔"

گروپ کیپٹن ہنسا۔

"ٹھیک کہتی ہو مگر..... لہجہ بدل کر دھیرے سے بولا۔

"ابھی تو میں پہلے بوسے کی امید میں ہوں۔"

"لالی؟"

موہنی بڑے پیار سے اور بناوٹی غصّے سے گروپ کیپٹن لال کو جھڑک کر بولی۔

مگر درشن کو اس میں نہ بناوٹ دکھائی دی نہ غصّہ، اسے صرف پیار ہی پیار نظر آیا کیسی دمکتی ہوئی مسکراہٹ تھی موہنی کس پیار سے گروپ کیپٹن لال کا کو دیکھ رہی تھی اور اس نے اسے "لالی" کہا تھا۔

موہنی بولی "یہ بیڈ روم کا عطر ہے اسے لگا کر باہر نہیں گھوما کرتے"۔

"کیوں نہیں گھوم سکتے؟" گروپ کیپٹن نے پوچھا۔

"اگر تم بیڈ روم کا پائجامہ سوٹ پہن کر باہر گھوم سکتے ہو تو ضرور اس عطر کو لگا کر بھی باہر گھوم سکتے ہو۔ اگر تم پیرس میں ہوتے تو لوگ یقیناً تمہارا مذاق اڑاتے"۔

"تو مجھے اس وقت کون سا عطر لگانا چاہیئے"۔

"مس!" درشن ذرا بے چینی سے بولا۔

"پلیز" موہنی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے انتظار کرنے کو کہا اور پھر مسکرا کر لال کاکا سے باتیں کرنے لگی۔

"بتاؤ نا موہنی! میں اس وقت ایک ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ بیڈ روم میں بھی جانا پڑے....."

"بے حد شرمیلے ہو" موہنی پھر بناوٹی غصّہ سے بولی۔

"میں تم کو ایک ایسا عطر دیتی ہوں جو ڈرائنگ روم اور بیڈ روم دونوں جگہ کام آ سکتا ہے"۔ موہنی عطر تلاش کرنے لگی۔

گروپ کیپٹن بلند آواز میں بولا۔ "تم نے ہمیشہ انکار کیا ہے مگر اب میں انکار کا ایک لفظ نہیں سنوں گا، کل میری سالگرہ ہے تمہیں پارٹی میں آنا ہوگا"۔

"اگر تم مجھے لینے آؤ گے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی"۔

گروپ کیپٹن لال کاکا نے زور سے پُرمسرت سیٹی بجائی۔ درشن جلدی سے قدم اُٹھاتا

ہوا دکان سے باہر چلا گیا، موہنی نے کنکھیوں سے اسے باہر جاتا ہوا دیکھا، جب وہ عطر لے کر واپس آئی تو گروپ کیپٹن نے چلّا کر کہا۔

"تمہارے چہرے کو کیا ہوا، اس قدر زرد و پیلا....؟"

موہنی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مجھے چکر آ رہا ہے"۔

اس کے بعد دو ماہ تک درشن کی صورت دکھائی نہیں دی، نہ وہ دکان پر آیا، نہ باہر کی بھیڑ میں کبھی دکھائی دیا، جہاں سے موہنی کے دل میں ایک جھرنا سا پھوٹا تھا، وہاں پر موہنی نے ایک بڑی سی پتھر کی سِل رکھ دی، اندر سے زخم رستا ہے، رستا ہے، باہر سے کچھ نظر نہ آئے، البتہ راتوں کو اب بھی اسے نیند نہ آتی تھی، اسے سلیپنگ پلز لینے کی عادت پڑ گئی، محبوب کو واپس بلانے کی دوا تو کسی ڈاکٹر نے ایجاد نہیں کی، لیکن نیند کو تو دوا کے زور پر بلایا جا سکتا ہے، یہی غنیمت ہے۔

ایک روز وہ آیا، وہ بیحد دُبلا پتلا ہو گیا تھا، کم سے کم موہنی نے درشن کو اس قدر بیمار اور دُبلا کبھی نہ دیکھا تھا، اس کے کپڑے بھی اچھے نہ تھے۔

پتلون میں کریز نہ تھی، قمیص کے دو بٹن غائب تھے آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کئی دن سے نہیں سویا ہے، ڈاڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی مگر نجانے کیوں درشن کو دیکھ کر موہنی کا دل اندر سے پگھلنے لگا، اس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی والا چہرہ بیحد دلکش معلوم ہوا مگر وہ چُپ سی حیران کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

درشن نے کہا۔ "مجھے سٹونی ہارٹ کی ایک شیشی دیدو"۔

موہنی بولی "کیا تمہارے ہاں کسی کی موت ہو گئی ہے"۔

"نہیں! میری شادی ہونے والی ہے"۔

موہنی کا دل ایک لمحہ کے لئے رُک گیا، رک کر زور زور سے دھڑکنے لگا، اس کا سارا جسم لرزنے لگا، اس کے ہاتھ پاؤں اس کے قابو میں نہ تھے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے کس سے کہے، کیوں کہے بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پا کر چہرہ پر ایک مصنوعی تبسم لا کر کہا۔

"سٹونی ہارٹ نوماتمی خوشبو ہے، شادی کے لئے موزوں نہیں ہے"۔ کیا آپ .... آپ کی شادی ہو رہی ہے"؟

"میرے گاؤں میں میرے باپ کر رہے ہیں، میں نے ہاں کردی ہے آج رات کو جا رہا ہوں"، درشن رک رک کر بولا اس کا چہرہ بیحد سنجیدہ تھا۔

"میں آپ کو ایک بہت عمدہ خوشبو...... آپ کی دلہن کے لئے دوں گی"، "جائے مسرت"۔ اپنی طرف سے تحفہ میں دوں گی"؛ درشن نے کوئی جواب دیئے بغیر سٹونی ہارٹ عطر کے دام کاؤنٹر پر رکھ دیئے، موہنی کے لئے کوئی راستہ باقی نہ رہا، اس نے سٹونی ہارٹ کی شیشی اٹھا کر درشن کو دیدی، درشن نے شیشی اس طرح سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لی، جیسے موہنی سے اپنے جرم کی آخری سزا پا رہا ہو، شیشی لے کر وہ سر جھکائے دھیرے سے باہر جانے لگا۔

"مت جاؤ درشن" موہنی نے اپنے دل ہی دل میں کہا، اندھے بیوقوف احمق، کیا تم نہیں جانتے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں؟ کیا تم صرف میرا فرنچ گاؤن دیکھتے ہو، میرا امریکی پرس دیکھتے ہو، یہ سنہری زلفیں دیکھتے ہو، رنگین ناخن دیکھتے ہو، وہ زخم نہیں دیکھتے جو میرے دل کے اندر رس رہا ہے، میرے حالات تو دیکھو، میری مجبوری تو دیکھو......

مت جاؤ درشن میں ایک امیر شہزادی نہیں ہوں، تمہاری طرح ایک غریب لڑکی ہوں، جس کی ایک بوڑھی ماں ہے، ایک اندھی خالہ ہے، دو چھوٹے چھوٹے بھائی ہیں جو ناگپاڑے کی ایک گندی چال میں رہتے ہیں، درشن کیا تم تین سو روپے میں ہم سب کو سنبھال نہیں سکتے، ارے میں گھر کے سارے کپڑے دھو دونگی، خود اپنے ہاتھ سے استری کروں گی، تمہارے لئے کھانا پکاؤں گی اپنے ہاتھ سے تمہیں کھلاؤں گی، اور جب تم تھکے ہارے سو جاؤ گے تو تمہارے پاؤں دباؤں گی، مجھے اپنے چرنوں سے لگا لو درشن، میرے کپڑے فرانس کے ہیں لیکن میرا دل ہندوستانی عورت کا ہے ظالم مت جاؤ.... مجھ سے مت کچھ کہلواؤ، میری صورت کو تو دیکھ لو۔ دن رات فائلیں پڑھنے والے درشن، کیا تم ایک غریب لڑکی کے چھوٹے سے چہرے کو نہیں پڑھ سکتے!۔

مگر موہنی کچھ کہہ نہ سکی، درشن دھیرے دھیرے دکان سے باہر نکل گیا۔

درشن کے چلے جانے کے بعد وہ یکایک چکرا کر فرش پر گر پڑی، جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے اپنے آپ کو وارڈن روڈ کے فلیٹ میں پایا، مادام سوسنا ہر طرح سے اس کی دلداری میں مصروف رہی، سوسنا بڑی گھاگ عورت تھی۔

اس نے موہنی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی بلونت رائے گو خاموشی سے دکان پر بل کاٹتا رہتا تھا، لیکن دیکھتا سب کچھ تھا اس نے درشن کے بارے میں مادام کو سب کچھ بتا دیا تھا، اور مادام اس وقت موہنی پر واری جا رہی تھی۔

کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے موہنی، میں سب سمجھتی ہوں مگر عزیز بچی۔ یہ تمہاری زندگی کا پہلا غم ہے، اسے تو کسی نہ کسی طرح کھا لینا چاہیئے، اس غم کی بنیاد پر تم اپنی زندگی کی مسرت تعمیر کر سکو گی، تمہیں میری بات سن کر اچنبھا ہو گا، مگر یہ بالکل سچ ہے اس دل کو چرکا کھانے دو کیونکہ تمہارے مسائل بہت بڑے اور الجھے ہوئے ہیں، تمہارے بھائی، تمہاری ماں، شادی تو آخر میں ہر عورت کو کرنا ہے مگر سوچ سمجھ کر دل کے ہاتھوں لٹ کر نہیں، دل پر قابو پا کر، پانچ چھ سال یہاں کام کرو گی کچھ روپیہ بچا لو گی، پھر دھیرے دھیرے تمہاری بڑھتی ہوئی شہرت ایک دیرپا خوشبو کی طرح ہائی سوسائٹی میں پھیل جائے گی، اور تمہیں ایک دن ایک ایسا شوہر مل جائے گا جو مالدار بھی ہو اور تمہاری پسند کا بھی ہو، یہ دونوں چیزیں زندگی کے لئے انتہائی ضروری ہیں۔ میری ڈارلنگ۔

اس لئے اس غم کو سہہ لو، اس دُنیا میں سچی مسرت غم کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ جس طرح سے ہر اچھی خوشبو کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تھوڑی سی بدبو کے اجزا بھی شامل ہوں، شاید تمہیں معلوم نہیں ہے، میری بھولی بچی کہ ہمارے فرانسیسی عطر ساز سو طرح کی خوشبوؤں کو ملا کر ایک خوشبو تیار کرتے ہیں، مگر ہر خوشبو کی بنیاد میں کسی نہ کسی بدبو کے اجزا بھی شامل رہتے ہیں، اسی بدبو کی بنیاد پر عطر کی خوشبو پھیلتی ہے، یہ زندگی کا اصول ہے۔

موہنی نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے سوچا، کیسا یہ زندگی کا اصول ہے؟ محبت کا غم کھا کر، ا

دولت کا انتظار کرو، بھائیوں کو پالو، اور جوانی کو کھو دو، طرح طرح کی خوشبوؤں کو حسن کی معشوق طرازیوں میں لپیٹ کر لوگوں تک پہنچا دو، لیکن اگر تمہارے نتھنوں تک کہیں سے محبت کی اڑی اڑی سی خوشبو بھی آجائے، تو فوراً منہ پھیر لو، کیونکہ اس سے کسی کی تجوری پر زد پڑتی ہے اور یکا یک موہنی کی سمجھ میں آگیا کہ نورٹ کے علاقے کی جتنی خوشبوئیں ہیں ان سب کی بنیاد ناگپاڑے کی بدبو پر ہے، مگر جب یہ بات اس کی سمجھ میں آئی وہ جرکہ کھا چکی تھی، اس کی مسرت سے جیتی ہوئی درشن جا چکا تھا۔

مادام نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میں اگلے ماہ سے تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر رہی ہوں۔"

شام کو وہ گھر پہنچ گئی۔ اس کی ماں اتنے دنوں سے اسے رام راج دکھانے پر اصرار کر رہی تھی، موہنی نے اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ ماں کو سینما دیکھنے کے لئے روانہ کر دیا انہیں آنے جانے کے لئے ٹیکسی کے پیسے بھی دے دیئے، وہ آج شام چند گھنٹوں کے لئے بالکل اکیلا رہنا چاہتی تھی۔ جب اس کے بھائی اور ماں چلے گئے، تو اس نے اپنے بستر کو ٹھیک کیا، بستر کے قریب کی کھڑکی کھول دی، پرس کھول کر اس میں "جلتے" عطر کی شیشی نکالی جو وہ درشن کی دلہن کو تحفہ میں دینا چاہتی تھی، پھر اس نے ایک خط اپنی ماں کو لکھا۔ ایک درشن کو اس کے آفس کے پتہ پر پھر اس نے سلیپنگ پلز کی ساری گولیاں اپنی ہتھیلی پر انڈیل لیں، اور انہیں کھا کر بستر پر دراز ہو گئی۔

کھڑکی سے باہر میلی نیلی چھتوں سے پرے آسمان تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے پردوں کو ہلانے والی ہوا، پیاز، ہلدی اور کڑوے تیل کی بدبو سے لبریز ہوتی جا رہی تھی، بچے چلا رہے تھے، مائیں پیٹ رہی تھیں، غریبی نے اپنا چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچ لیا تھا۔

جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور کمرے کی ہر شے اسے اپنے گرد گھومتی دکھائی دینے لگی تو اسے کچھ یاد آیا، بڑی مشکل سے اس نے اپنا ہاتھ اپنے پرس کی طرف بڑھایا اور اس میں سے ٹٹول کر سٹونی ہارٹ کی شیشی نکال لی، وہ اسے اپنے بستر پر چھڑکنا چاہتی تھی، مگر اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی۔ سٹونی ہارٹ کی شیشی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ

کر فرش پر جا گری اور عطر فرش پر دھیرے دھیرے بہنے لگا۔

دوسرے لمحے میں پرس بھی موہنی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

گاڑی جانے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا اور فلاری ڈن سوزا اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ کر درشن سے کہہ رہی تھی،

"سلی فول، تم نے اپنی محبت کا اظہار تو اس سے کیا ہوتا؟"

"اس کی ضرورت نہ تھی" درشن اداسی سے بولا "وہ سب جانتی تھی، اس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔"

"کیسے تم یہ کہہ سکتے ہو" فلاری ذرا غصے سے بولی۔

"کیا تم نے اس سے شادی کی درخواست کی تھی؟"

"نہیں! مگر کیا وہ اتنا نہیں سمجھ سکتی تھی؟" درشن نے چڑ کر کہا۔

فلاری انتہائی غصے سے بولی۔ "تم نے اس سے پوچھا تو ہوتا، اس سے کہا تو ہوتا، اس کا انکار سننا تو ہوتا، لوگ تو پانچ پانچ برس تک عورت سے انکار سنتے ہیں آخر میں اس سے ہاں کرا لیتے ہیں۔"

"کوئی فائدہ نہ ہوتا فلاری" درشن نے کندھے جھٹک کر کہا۔ "وہ امیر تھی میں غریب تھا وہ وارڈن روڈ پر رہتی تھی، اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دکان پر آتی تھی، ہزار روپے کا گون پہنتی تھی۔"

"اوہ جاہل! جاہل!" فلاری چلائی۔ "تم نے سب چوپٹ کر دیا، ارے بیوقوف وہ تو میری طرح غریب لڑکی ہے، مادام کی گاڑی میں آتی تھی، مادام کی گاڑی میں جاتی تھی، گون اس کے اپنے نہ تھے دکان کے تھے، وہ وارڈن روڈ پر نہیں رہتی تھی، ناگپاڑے میں رہتی ہے ایک معمولی کھولی میں اس کا ایڈریس مجھے معلوم ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

فلاری نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "جس دن سے تم نے مجھے سینما لے جانا بند کر دیا، میری طرف پیار سے دیکھنا بند کر دیا، کہ میں اتنا بھی نہ معلوم کرتی؟ گدھے! گدھے! فلاری نے اپنا

پرس کھولا اور اس میں سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر درشن کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"یہ اس کا پتہ ہے"

اس کے بعد نلاری روتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی۔

درشن تھوڑی دیر تک تو بھونچکا اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر یکایک اسے کچھ یاد آیا اس نے کاغذ کے پرزے کو بڑے غور سے دیکھا، اپنا بیگ اٹھایا اور اسٹیشن کے باہر آ کر ٹیکسی تلاش کرنے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"موہنی! موہنی"

دروازہ کسی نے نہ کھولا۔

"موہنی ..... موہنی ..... میں آ گیا ہوں، میں درشن ہوں، میں تیرا درشن ہوں، موہنی دروازہ کھولو، میری موہنی"

مگر دروازہ کسی نے نہ کھولا۔

درشن نے ذرا سا زور لگایا، دروازہ خود بخود کھل گیا، درشن اندر چلا گیا۔

سامنے بستر پر موہنی مری پڑی تھی۔ تپائی پر دو خط تھے، ایک موہنی کی ماں کے نام، ایک درشن کے نام، ایک عطر کی شیشی "جائیے" درشن کی دلہن کے لئے ..... ایک عطر کی شیشی فرش پر گر کر ٹوٹ چکی تھی .... اور اس کی خوشبو۔ اور اس خوشبو ساری فضا میں پھیل رہی تھی۔

"موہنی" درشن نے رندھے ہوئے گلے سے کہا "یہ انتظار تو کیا ہوتا! پگلی"

تھوڑی دیر تک وہ چپ چاپ ساکت کھڑا رہا۔

پھر یکایک وہ بستر پر گر گیا اس نے موہنی کے دونوں پاؤں اپنے ماتھے سے لگا لئے، پھر اپنے ہونٹوں سے لگا لئے .... پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا،

اوہ .... اوہ سٹونی بارٹ ••

ترازو

مسٹر رام لبھایا رنگ کے اعتبار سے شلجم تھے، ہونٹوں کے اعتبار سے ٹماٹر، چہرے کی ساخت سے امرود اور لڑھکنے میں تھالی کے بینگن دکھائی دیتے تھے۔ یعنی عالم نباتات کی اتنی خوبیاں اُن میں جمع ہو گئی تھیں کہ اگر انہیں آدمیوں کی صف میں کھڑا کرنے کے بجائے پھلوں اور ترکاریوں کی نمائش میں رکھ دیا جاتا تو اول درجے کا انعام پاتے۔

لیکن اگر ان کا شمار آلوؤں کے بجائے آدمیوں میں ہوتا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے اور اکثر بہت تیزی سے چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں میں بلی کی سی پھرتی، جسم میں نیولے کی سی لچک اور چال میں مولے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس اعتبار سے اُن کا شمار جانوروں میں ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے گھر میں رہنے کے بجائے کسی چڑیا گھر کے پنجرے میں بند ہوتے اور ہم ہر اتوار کو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر انہیں دیکھنے جاتے اور انہیں مونگ پھلی اور بھنی ہوئی دال کھلاتے اور حیرت کرتے کہ قدرت نے کیسے کیسے نادر شاہکار تخلیق کئے ہیں۔ لیکن مسٹر لبھایا جانور نہیں، انسان تھے۔ اور ان کا شمار انسانوں میں اس لیے ہوتا تھا کہ وہ عشق کرتے تھے یہ عشق ہے جو آدمیوں کو عالم حیوانات نباتات اور جمادات سے بلند کرتا ہے۔ عشق نہ ہو تو آدمی اور کدو میں کیا فرق ہے۔

مسٹر رام لبھایا کے عشق کا حال تو بہت بعد میں آئے گا۔ ابھی یہاں ان کی آنکھوں کا حال بیان کرنا باقی ہے۔ آنکھوں سے نیچے کا حصہ بہت سے دوسرے چہروں کی نقل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کا ماتھا اور ان کی آنکھیں اپنی ہیں۔ یہ آنکھیں ہر وقت ایسی بے قرار، بے چین اور مضطرب رہتی ہیں کہ ان کی رنگت کبھی معلوم نہیں ہو سکتی، بھوری ہیں کہ کالی؟ کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بس یہی

معلوم ہوتا ہے کہ دو سیماب صفت پتلیاں ہیں جو آنکھوں کی سپیدی میں بہت بے چینی سے اِدھر اُدھر حرکت کرتی رہتی ہیں اور پھر ان آنکھوں کے اُوپر ان کے ابرو ہیں جن کا تعلق کسی اندرونی کمانی سے ان کی پتلیوں تک ہے۔ یعنی یہ ابرو بھی ان کی آنکھوں کی پتلیوں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں، اوپر نیچے، دائیں بائیں۔ یہ آبرو ہر سمت، ہر طرف حرکت کر سکتے ہیں کبھی تو وہ قوس کی طرح خمیدہ نظر آتے ہیں اور کبھی خطِ مستقیم کی طرح سادہ۔ یہ ابرو کبھی تو سکڑ کر ہٹلر کی مونچھیں دکھائی دیتے ہیں اور کبھی پھیل کر سانپ کی کینچلی کی طرح نظر آتے ہیں اور سانپ اپنی کینچلی چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ ابرو کبھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتے۔

ابروؤں سے اوپر مسٹر رام لبھایا کا ماتھا ہے۔ ماتھا کیا ہے؟ اُن کی ہستی کا سمندر ہے یہ سمندر کبھی تو بحرالکاہل کی طرح خاموش اور شانت نظر آتا ہے، کبھی اس میں اتنے مدّوجزر اُٹھنے لگتے ہیں کہ ماتھا لہروں سے معمور نظر آتا ہے جنھیں عام طور پر لوگ شکنیں کہتے ہیں۔ مسٹر رام لبھایا کے ماتھے کی شکنیں بہت مشہور ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو اُن کا حال معلوم ہے۔ مثال کے طور پر بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ جب اُن کے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک گہری شکن پڑتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دفتر میں ان کی بے عزتی ہوئی ہے اور جب اُن کے ماتھے پر چار شکنیں نمودار ہوتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس وقت عشق کر رہے ہیں، جب تین شکنیں ہوتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں، ڈھائی شکنیں ہوں تو سمجھ لیجیے کہ کسی الجھن میں گرفتار ہیں اسے حل کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ جب ماتھا بالکل صاف ہو، وہاں ایک شکن بھی نہ ہو تو سمجھ لیجیے کہ کوئی دوست ان سے قرض مانگ رہا ہے اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میری جیب خالی ہے۔

جو سیمابی کیفیت ان کی آنکھوں میں موجود ہے، وہ اُن کی گفتگو سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی گفتگو میں وقفے نہیں ہوتے، جملوں میں فل اسٹاپ نہیں ہوتے، لفظوں کی کمر نہیں ہوتی۔ یہ سب الفاظ اور جملے کمر سے اوپر ایک دوسرے سے سیامی جڑواں بچوں کی طرح جڑے ہوتے، ایک دوسرے کے ساتھ لگے جادوگر کے فیتے کی طرح اُن کے مُنہ سے نکلتے آتے ہیں۔ مثال کے

طور پر اگر انہیں یہ کہنا ہے "معاف کیجئے میں یہ پن یہاں سے لے کے منڈی چلا جاؤں؟ تو وہ اسے اس طرح ادا کریں گے۔ معاف کیجئیے یہ پن لے کر یہاں سے لے کے منڈی جاؤں۔ اس کے بعد آپ کیا کہیں گے؟ اور آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے کہ آپ کچھ کہہ سکیں، وہ آپ کا پن لے کے اور "میں ابھی آیا" کہہ کے غائب ہو چکے ہوں گے۔ میں ابھی آیا" وہ دن میں اکثر کئی بار اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں اور اکثر ایسے موقعوں پر استعمال کرتے ہیں جب انہیں کہیں جا کے جلد واپس نہیں آنا ہوتا ایسے موقعوں پر وہ بھی کہتے ہیں اور اکثر چٹکی بجا کر کہتے ہیں "میں ابھی آیا اور اس کے بعد ایسے غائب ہوتے ہیں کہ گدھے کے سر پر سینگ تو دوبارہ آجاتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں آتے۔ اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے ان کے بہت سے دوست مسٹر رام لبھایا کو مسٹر ابھی آیا کہتے ہیں۔

مسٹر رام لبھایا المعروف "ابھی آیا" نیویارک ریڈیو کمپنی میں ملازم ہیں۔ یہ کمپنی نیویارک میں نہیں ہے۔ دہلی میں ہے۔ بصرہ کا لوئی دہلی میں۔ ریڈیو بیٹریاں، مائیکروفون، لاؤڈ اسپیکر، ٹیپ ریکارڈ، پنکھے، دفتروں کے لیے اندرونی ٹیلی فون ایکس چینج وغیرہ، اس قسم کی بہت سی چیزوں کے بیچنے اور کرائے پر دینے کی بہت بڑی دکان ہے۔ جہاں مسٹر رام لبھایا دوسرے پچیس ملازموں کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ مسٹر رام لبھایا اس دکان پر یوں کہنے کو تو محض ایک کلرک بھرتی ہو کے آئے تھے لیکن انہوں نے آتے ہی ریڈیو، بیٹری، مائیکروفون، لاؤڈ اسپیکروں سے وہ چھیڑ چھاڑ شروع کی کہ تھوڑے ہی دنوں میں خود مائیکروفون فٹ کرنے لگے۔ لاؤڈ اسپیکر لگانے لگے، ٹیپ ریکارڈ چلانے لگے، پنکھے فٹ کرنے لگے۔ کلرک، مستری، مکینک، مزدور، سب کا کام خود کرنے لگے۔ دکان کا مالک سیٹھ بھگوان رام بھگوانی ان کے کام سے، پھرتی سے اور مستعدی سے اتنا خوش ہوا کہ تین سال کے عرصے میں اس نے ان کی تنخواہ اسی سے بڑھا کر ایک سو پچیس کر دی اور دراصل مسٹر رام لبھایا کو کام کرنے کا شوق بھی ہے اور اس قدر ہے کہ اگر کسی بیاہ شادی میں لاؤڈ اسپیکر فٹ کرنے جائیں گے تو نہ صرف لاؤڈ اسپیکر فٹ کر کے گانے سنائیں گے بلکہ گانوں کے درمیان مختلف اعلان بھی کرتے جائیں گے، لطیفے بیان کریں گے۔ ہوتے ہوتے شامیانے، برات، گھر کے دروازے سے گزرتی ہوئی عورتوں کے لیے مفصل

ہدایات جاری کرتے جائیں گے۔ تھوڑی دیر میں آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ اس سرے کے بڑے بزرگ اور برات کے دولہا مسٹر رام لبھایا ہی ہیں اور یہ جو لڑکے کا باپ ہے اور وہ جو اس کا ماموں ہے ؛ زرا چغد ہے۔ اُن لوگوں کو کچھ آتا جاتا نہیں اور اگر مسٹر رام لبھایا خوش قسمتی سے اپنا ریڈیو اور مائیکروفون لے کے یہاں نہ آجاتے تو یہ شادی کبھی نہ ہو سکتی تھی۔ کچھ اس قسم کا تاثر اتنی جلدی پیدا کر لیتے ہیں کہ چند گھنٹوں بعد ہی آپ کو گھر کے اندر بلا لیا جاتا ہے جہاں آپ چند منٹوں ہی میں ماں جی بہن جی، موہنی جی، چاچی جی، بھابھی جی بنا لیتے ہیں، اور پھر بڑے مزے سے عورتوں کے درمیان بیٹھ کر ٹھنڈا شربت پیتے ہیں۔ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہیں، اپنی سیماب صفت پتلیاں خوب صورت لڑکیوں کے درمیان گھماتے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد جب شادی ہو جاتی ہے تو آپ سب سے پہلے اپنے بل کی رقم ماں جی سے وصول کر کے اور "میں ابھی آیا" کہہ کے ایسے غائب ہوتے ہیں کہ ماں جی پوچھتی ہیں وہ میرا بیٹا کہاں گیا؟ اور کب آئیگا؟ غالباً دوسری شادی پر۔

لیکن ان تمام دلچسپ باتوں کے باوجود میرے لیے اور میری طرح سیٹھ بھگو رام بھگوانی کی دکان پر کام کرنے والے دوسرے ملازموں کے لیے مسٹر رام لبھایا کی ذات اتنی دلچسپ نہ ہوتی اگر ان دنوں ہمارے دفتر میں ایک نئی لیڈی ٹائپسٹ مس ڈیزی سوزیل نہ آجاتی۔ اس کے آنے سے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے ریڈیو، پنکھوں، مائیکروفون اور قمقموں سے بھری ہوئی دکان یکایک پھولوں سے لدگئی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک ہی عورت کے آجانے سے ہماری دنیا میں بہار آجاتی ہے، چیزیں قرینے سے رکھی جانے لگتی ہیں، گفتگو میں گالی کا استعمال کم ہونے لگتا ہے، بے تحاشا قہقہے مہذب تبسم میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ستدر لال جس کی پتلون کی کریز کبھی ٹھیک نہیں ہوتی تھی، اب ہر روز کیسی صاف ستھری تیز دھار والی پتلون پہن کر آتا ہے اور محی الدین جو ہمارے مذاق کرنے کے باوجود ہر تیسرے دن ہی اپنی قمیص تبدیل کرتا تھا، اب ہر روز ایک نئی صاف ستھرے کالر والی قمیص پہن کر آتا ہے جس دن ڈیزی آئی۔ اس روز بازار سے کتنے ہی کنگھے خریدے گئے کتنے ہی گھروں میں قمیصوں اور پتلونوں پر استری ہوئی کتنی ہی بار آئینے دیکھے گئے، تیل پاؤڈر اور کریم اور وہ

ایک بے نام سی تھرتھراتی ہوئی خوشبو جو ایک خوب صورت عورت کے تصور سے پیدا ہوتی ہے ، کتنے ہی دلوں کو لبھا گئی ۔ حسین عورت میں کیسا جادو ہوتا ہے ؟ وہ جادو جو پھول میں نہیں ہوتا شفق میں نہیں ہوتا آبشاروں کے گرنے اور ابابیل کے اڑنے اور بلبل کے چہکنے میں نہیں ہوتا یہ ایسا کیسا جادو ہے ؟ جب پھول کی مہک شفق کی موہنی ، ابابیل کی پرواز آبشار کی چال اور بلبل کی آواز ایک ہی ہستی میں سمٹ کر آجاتی ہے ، اس طرح جب وہ ہنستی ہے تو اس کا نقرئی قہقہہ ابابیلوں کی طرح فضا میں پرواز کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور جب وہ چلتی ہے تو سفید ساڑی کا گرتا ہوا پلو آبشاروں کی یاد دلاتا ہے اور جب وہ تمہارے قریب سے گزر جاتی ہے تو ہزاروں پھولوں کے ننھے ننھے تمہارے رگ و پے میں کھلتے ہی چلے جاتے ہیں ۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیئے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے ؟

پتہ نہیں ، مسٹر رام لبھایا نے یہ سب کچھ کہاں تک محسوس کیا ؟ لیکن ڈیزی کی آمد سے ایسا ضرور معلوم ہوتا تھا جیسے رام لبھایا کے اندر کی بیٹری زیادہ چارج کر دی گئی یا ان کے جسم کے اندر برقی دباؤ یکایک بڑھ گیا ہے وہ اس طرح بار بار ۔ اچک رہا تھا ۔ پھاند رہا تھا ۔ دکان کے اس کونے سے اس کونے تک اپنے تیز تیز لہجے میں باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں مرکری دیوتا کے پر لگ گئے ہوں ۔ اس روز اس کی ہر حرکت جنس نازک کو اپنی طرف آمادہ کرنے پر مائل تھی وہ اپنے امرود سے چہرے پر اپنے ٹماٹر کے سے ہونٹوں سے ہنستا ہوا بار بار ڈیزی کی میز سے گزرا اور اس وقت تک اسے چین نہ آیا جب تک اس نے کسی انڈینٹ یا انوائس یا کسی الم غلم بل کے سلسلے میں ڈیزی سے بات نہ کرلی ۔ "مسعجیا پیکتوں "

"بگ یور پارڈن " ڈیزی حیرت سے بولی ۔

ایک لمحے کے لیے تو رام لبھایا بھی چکرا گیا ۔ پھر یکایک اسے خیال آیا کہ وہ بہت تیزی سے بات کر رہا ہے ۔ اس لیے اب اس نے آہستہ آہستہ رک رک کر اپنی فطرت کے خلاف یہ فقرہ یوں ادا کیا ۔ "مس صاحب ! میں آپ سے یہ کہتا ہوں ..... " چلئے انٹروڈکشن تو ہو گئی ۔ دکان میں کچھ دیر تک سکون اور آرام سے کام ہوتا رہا لیکن لنچ کے قریب مسٹر رام لبھایا نے پھر اسی طرح بھاگ دوڑ

شروع کردی جیسے پروانہ شمع کے گرد رقص کرتا ہے۔ رقص کے گھیرے چھوٹے ہوتے گئے، چھوٹے ہوتے گئے۔ آخر گھوم گھام کے ڈیزی کی میز کے پاس رک گئے۔ ڈیزی کے کان میں آواز آئی۔ مسیجیا پینچیلیکھائیں گی۔؟

ڈیزی نے اپنی گھومتی ہوئی پلکیں اٹھا کر اپنی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے مسٹر رام لبھایا کی طرف اس طرح دیکھا کہ وہ بے چارہ اپنی ساری سٹی بٹی بھول گیا۔ ڈیزی نے اسی طرح تبسم لہجے میں پوچھا

"بگ یور پارڈن ؟"

"مس صاحب آپ لنچ کہاں کھائیں گی ؟ رام لبھایا نے پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا میرا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے بہت ہی قریب میں ایک بہت ہی سستا لنچ مع سویٹ ڈش آٹھ آنے نو پائی میں گو یا کہ....."

خیر جی، جو کچھ بھی ہو۔ وہ لنچ سستا تھا یا مہنگا۔ یہ ہم سب خوب جانتے تھے کہ قریب کے ریستوران ٹٹ بٹ میں لنچ ساڑھے بارہ آنے سے کم میں نہیں ملتا ہے۔ رام لبھایا آٹھ آنے نو پائی ڈیزی سے دلوائے گا، بقیہ رقم اپنی جیب سے ڈالے گا اور ڈیزی کو لنچ کھلائے گا یوں ہی ہوتا ہے ہر جگہ ساری دنیا میں یوں ہی ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ مقصد رام لبھایا کا ڈیزی کو لنچ کھلا کر رام کرنا تھا، وہ پورا ہو گیا۔ جب وہ دونوں لنچ کھا کے ریستوراں سے لوٹے تو بالکل بھائی بہنوں کی طرح بات کر رہے تھے۔ ڈیزی حسین ہونے کے باوجود دل کی بُری نہیں تھی، جیسے اکثر حسین لڑکیاں ہوتی ہیں، بے چاری اپنی خوب صورت فراک، خوب صورت چہرے اور خوب صورت جسم کے باوجود بالکل بھولی اور معصوم تھی۔

بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ لڑکیاں جو لبوں پر لپ اسٹک، رخساروں پر غازہ اور گفتگو میں انگریزی استعمال کرتی ہیں، بڑی شرافہ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ خیال کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے اپنے خالص ہندوستانی گھروں میں ایسی پیچ در پیچ تہہ دار گہری شخصیت

ں لڑکیاں دیکھی ہیں کہ اگر فرائڈ بھی ان کا مطالعہ کرے تو دوسرے ہی دن غش کھا کر گر
ے، جی، کیا سمجھا ہے آپ نے؟ اور یہ جو بے چاری دفتروں کی ڈیزی، چھنبری، روزی
تی ہیں۔ اپنی چلت پھرت کے باوجود نہایت ہی سادہ شخصیت والی، نادان بلکہ احمق ہوتی
۔ بہت جلد اعتبار کر لیتی ہیں، دل دے بیٹھتی ہیں اور پھر ایک دن روتی ہوئی گرجا کے بجائے
ل پہنچ جاتی ہیں۔ یہ اچھی غریب، بے کس اور معصوم اداؤں والی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جی کیا
ھا ہے آپ نے؟۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ڈیزی بھی ایسی بے وقوف تھی۔ یقیناً وہ ایسی نہیں تھی لیکن وہ سیدھی
دی اپنا کام سنجیدگی سے کرنے والی ہنس مکھ لڑکی ضرور تھی۔ وہ چالاک نہیں تھی لیکن صاف
ضرور تھی جو بات اس کے دل میں ہوتی، صاف صاف سب سے کہہ دیتی، یعنی وہ بات جس
مارے درمیانی درجے کے معاشرے کے افسانے میں کہیں ذکر نہیں ہوتا مگر زیر لب، زیر حاشیہ
بین السطور پر گفتگو میں ہر لمحے محسوس ہوتا رہتا ہے۔ وہ یہ بات چھپانے کے حق میں نہیں تھی مسٹر
لبھایا کو بہت حیرت ہوئی جب تین دن لنچ کھلانے کے بعد اور ایک شام سینما دکھانے کے
اس نے ڈیزی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا تو ایک زور کا طمانچہ اس کے رخسار پر پڑا۔ بس اسکے
کچھ نہیں ہوا۔ نہ ڈیزی نے اس سے آگے کچھ کہا نہ مسٹر رام لبھایا اس سے آگے کچھ بڑھا۔ وہ
دہیں کی وہیں رک گئی۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ ڈیزی کچھ خفا ہوئی ہو اور دوسرے دن دفتر
اس نے رام لبھایا سے بات نہ کی ہو یا اس کے ساتھ لنچ نہ کھایا ہو یا پھر ایک ہفتے بعد اس
ساتھ سینما نہ دیکھا ہو۔ ایسی کوئی خلاف توقع بات نہیں ہوئی۔ یوں بس اتنی سی بات
رہ ہوئی کہ اس نے رام لبھایا کی اچھلنے پھاندنے والی محبت کو راستہ دکھا دیا۔ اس کی حدیں
ر کر دیں۔ اسے شرافت کے ترازو میں ڈال کر ایک پلڑے میں محبت رکھ کر دوسرے پلڑے
شادی رکھ دی اور اب وزن برابر ہو گیا اور مسٹر رام لبھایا کو معلوم ہو گیا کہ اس کی محبت جب
دھرم کے کانٹے پر نہ تلے، اس کی ڈیزی اسے کبھی نہیں مل سکتی یعنی جس طرح وہ اسے حاصل کرنا

چاہتا تھا یا جس طرح اس نے سنا تھا کہ ایسی لڑکیاں حاصل ہو جاتی ہیں اور جب وہ یہ
تک پہنچا تو اس کے ماتھے پر چوتھی شکن نمودار ہوئی اور اسے محسوس ہوا کہ اسے ڈیزی سے
عشق ہو گیا ہے۔ اس لطیف جذبے کا احساس اگر اسے کسی باغیچے میں، کسی فٹ پاتھ پر
کرتے ہوئے یا ڈیزی کے ساتھ سینما دیکھتے ہوئے ہوتا تو وہ فوراً اس کا اظہار کر دیتا لیکن
کا احساس اسے دفتر میں بیٹھے بیٹھے اچانک ہوا جب وہ ایک ٹیپ ریکارڈر درست کر رہا
اس نے بہت مضطرب اور بے چین نگاہوں سے ڈیزی کی جھکی ہوئی آنکھوں اور گھومتی ہوئی
کی طرف دیکھا لیکن دکان میں وہ اظہار عشق نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں ریڈیو اور پنکھے۔ مائیکرو
اور بیٹریاں، بجلی کے تار اور سوئچ تھے اور وہ اس وقت اس سے محبت کی بات کیسے کرتا!
کیوں نہ کرتا؟ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے سامنے مائیکروفون رکھ کر کھڑا ہو جائے اور ساری د
اعلان کرے کہ ہیلو۔ ہیلو کالنگ ایوری باڈی سنو مجھے ڈیزی سے عشق ہو گیا ہے، سنو مجھے
سے عشق ہو گیا ہے۔"

اور عین ممکن تھا کہ وہ اپنی سیمابی فطرت سے مجبور ہو کر ایک مائیکروفون اٹھا کر ا
کا اعلان بھی کر دیتا لیکن عین اسی وقت سیٹھ بھگو رام بھگوانی ایک دبلی پتلی سانولی لڑکی کے
دکان میں داخل ہوا اور آتے ہی رام لبھایا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "مسٹر رام لبھایا! تم جلد
آپ کے ساتھ۔ یہ میری بھانجی ہے نرملا کے ساتھ جاؤ۔ ان کے کالج میں آج ڈراما ہے، وہاں ما
اور لاؤڈ سپیکر سب فٹ کرنے ہوں گے۔ جلدی جاؤ، بل لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ چار مائک
لے جاؤ، اور چھ لاؤڈ اسپیکر۔ جلدی کرو۔"

لوگ کہتے ہیں کہ مجنوں بہت بڑا عاشق تھا لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ مجنوں کو
کرنے کے لیے کئی آسانیاں فراہم کر دی گئی تھیں۔ لیلا اپنے محل میں تھی اور مجنوں صحرا میں تھا
اس کے چاروں طرف ریت کے ٹیلے تھے۔ اور چٹانیں تھیں۔ جنگل تھے اور جنگل کے وحشی ہرن
جن کے سامنے وہ چٹانوں پر سر پٹختا تھا۔ اور چیخ چیخ کے میری لیلا، میری لیلا کہتا تھا اور

بڑی بات یہ ہے کہ مجنوں کسی دفتر میں نوکر نہیں تھا آج کل کے رام لبھایا کو عشق کرنے میں کتنی
پیش آتی ہیں۔ اس کے پاس نہ صحرا ہے نہ جنگل ہے۔ دفتر کی میز کرسیاں ہیں ماہرن صرف
گھر میں ملتے ہیں اور لیلا کسی محمل میں نہیں ہوتی۔ اکثر سامنے میز پر دھری ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر
کا اظہار کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

مسٹر رام لبھایا نے بھی اُس وقت کچھ ایسی مجبور نگاہوں سے اپنی ڈیزی کی طرف دیکھا
پھر مائیکروفون، لاؤڈ اسپیکر اٹھائے مزدوروں کو ساتھ لے کر سیٹھ کی کمپنی کے ساتھ چلا
اور چلتے چلتے ڈیزی سے کہہ گیا میں ابھی آیا۔

اس روز ڈیزی کے ہاں ایک خاص دعوت تھی جس میں ڈیزی نے مجھے، محی الدین، شام
اور چمن مستری کو بلوایا تھا۔ رام لبھایا تو خیر وہاں تھا ہی، ہم لوگوں نے بھی ڈیزی اور رام
ایا کی محبت زہر مار کر لی تھی۔ اب ہمارے دفتر کے بابوؤں کے بال پھر الجھے الجھے رہنے لگے
ٹوٹ گئے، پتلونوں میں اب وہ کریز نہ رہی۔ بالوں میں تیل اور لباسوں میں خوشبو نہ رہی تھی
ن پھر میلی میلی قمیض پہن کر آنے لگا کیونکہ گزشتہ چھ مہینوں میں ہماری سب کوششیں رائیگاں
یں۔ ڈیزی اور رام لبھایا کی دوستی بدستور قائم تھی بلکہ اب تو معاملہ کچھ آگے بڑھ گیا تھا
محسوس ہوتا تھا۔ جیسے رام لبھایا اب ڈیزی سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ ڈیزی
ت میں وہ اب اس منزل پر آتا ہوا معلوم ہوتا تھا جہاں وہ اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف
ہمرح کر لے گا۔ اس کے ماں باپ بہت پرانے کٹر خیالات کے تھے جن کے خلاف اب اس کا جذبہ
ت ابھرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اپنی گفتگو میں وہ اکثر اس طرف ہلکے ہلکے اشارے کرتا تھا جس
محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی جرأت شوق میں ذات پات اور سماج کی بلند و بالا دیواریں پھاند
... تو ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے گھروں، چھوٹے چھوٹے دفتروں
نے چھوٹے گھروندوں میں بندھے ہوئے انسان تھے۔ جو دن بھر دفتروں کے گرد کولھو کے بیل کی
... اپنے گھر کی ناندیں مار کر چارہ کھا کر خوشی سے دُم ہلا کر

جگالی کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے آزادی کیا ہوتی ہے؟ عشق کسے کہتے ہیں؟ فضا کیسے مہ ہے؟ تارے کیسے یکایک کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں؟ ہمارے ذہنی افق کے اندھیرے میں ان باتوں کا گزر نہیں تھا۔ اس لیے ہم لوگ ڈیزی کی دعوت پر گئے اور جب ہم نے ڈیزی کو اور مسٹر رام لبھایا کو کاغذی پھولوں اور رنگین غباروں سے سجے ہوئے کمرے میں پُر تکلف پہنے ہوئے دیکھا تو حسد اور رشک کے ملے جلے جذبات سے ہماری آنکھیں چندھیا گئیں

"کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟" شام لال نے گھبرا کر پوچھا۔

رام لبھایا نے ہنس کر کہا: "ہوئی نہیں ہے آج ہونے والی ہے۔ اسی لیے تم لوگوں بلایا ہے۔ یہاں سے تم لوگ ہمارے ساتھ سول میرج کے رجسٹرار کے دفتر میں چل کر ہما شادی کراؤ گے۔ اور ہمارے کاغذات پر گواہی کے دستخط کرو گے"

"اور تمہارے ماں باپ؟" میں نے پوچھا

رام لبھایا نے کہا: "میں نے انہیں نہیں بتایا۔ تم چار دوستوں کے سوا یہ بھید ہر ایک سے محفوظ رکھا ہے"

ڈیزی بولی: "اس وقت ساڑھے بارہ ہیں۔ رجسٹرار کے ہاں تین بجے پہنچنا میرے خیال میں آپ کھانا کھا لیں"

ڈیزی نے بہت عمدہ کھانا تیار کیا تھا اور ہم لوگ بہت عمدہ طریقے سے اُ کے تیار کیے ہوئے کھانے کی تعریف کرتے رہے۔ کھانے کے دوران میں ایک لڑکا مسٹر لبھایا کے لیے ایک خط لے کے آیا جس کے پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ رام لبھایا کے ماتھے شکنیں چار سے ڈھائی ہو گئی ہیں اور وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آتا ہے۔ یوں وہ برابر رہا لیکن نہ جانے کیوں اس کے بعد مجھے اس کی ہنسی پھیکی اور مجبور سی معلوم ہوتی رہی۔ لیکن یہ خیال جلد ہی کھانے کی دلچسپ باتوں اور شادی کی تیاریوں میں غائب ہو گیا۔ کھانا کھا کے ڈیزی ا تبدیل کرنے کے لیے اندر چلی گئی۔ محی الدین نے ریڈیو چھیڑ دیا اور جمن خلال کرنے لگا۔ اتنے م

نے اندر سے آواز دی "ڈارلنگ! تم اتنے میں بھاگ کے ٹیکسی تو لے آؤ"

"ایک میں کیسے جائیں گے چھ آدمی ہیں" میں نے کہا۔

"تو دو لے آؤ" ڈیزی اندر سے بولی "مگر دیکھو جلد لے کے آؤ، وقت قریب آ رہا ہے ابھی آیا ڈارلنگ!"

دو بج گئے، ڈھائی بجے، پھر تین بجے لیکن رام لبھایا واپس نہیں آیا پھر چار بجے، ہم نے آس پاس کے سب ٹیکسی اسٹینڈ دیکھ ڈالے۔ رام لبھایا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دفتر میں ٹیلی فون کیا۔ وہاں بھی رام لبھایا کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ رجسٹرار کے دفتر میں ٹیلی فون کیا۔ لیکن رام لبھایا یہاں ڈیزی کے بغیر کیسے جا سکتا تھا؟ پولیس اسٹیشنوں پر اور اسپتالوں میں بھی ٹیلی فون کئے گئے کہ ممکن ہے کوئی حادثہ ہو گیا ہو؟ لیکن رام لبھایا جو خود ایک بہت بڑا حادثہ ہے، اسے کوئی حادثہ کیسے پیش آ سکتا ہے؟ رات کے دس بجے تک ہم نے رام لبھایا کے لیے شہر کا کونا کونا چھان مارا لیکن رام لبھایا نہ ملا۔ ڈیزی پریشان ہو کے رونے لگی۔

رات کے دس بجے جس وقت ڈیزی پریشان ہو کے رو رہی تھی، رام لبھایا دولھا کا سہرا باندھے اپنے ماں باپ کی معیت میں مس نرملا سے شادی کرنے سیٹھ بھگوان رام بھگوانی کے گھر جا رہا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جن دنوں وہ ڈیزی سے محبت کر رہا تھا، انہی دنوں اس نے سیٹھ کی اکلوتی بھانجی سے بھی اظہار عشق کر دیا تھا۔ کیونکہ آج کل زندگی اتنی ناپائدار اور غیر محفوظ ہے، یعنی کچھ ایسی غیر مستحکم حالت میں ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہو رہا ہے؟ ملک، قوم، ایمان، روزگار، کسی کا کچھ پتہ نہیں، ملک تقسیم ہو جاتے ہیں، قومیں بٹ جاتی ہیں، ایمان بدل جاتے ہیں۔ ایسے زمانے میں کوئی محض ایک عشق پر بھروسہ کرے تو کیسے کرے؟ اس لیے رام لبھایا نے دو عشق کر لیے تھے کہ اگر ایک فیل ہو جائے تو دوسرا محفوظ رہے گا۔ شروع شروع میں ڈیزی نے انکار کیا تھا لیکن آخر میں وہ راضی ہو گئی اور شادی کے لیے تیار ہو گئی۔ اس اثناء میں رام لبھایا برابر دوسری لڑکی سے عشق کرتا رہا۔ وہ لڑکی سیٹھ کی

اکلوتی بھانجی تھی اس لیے انکار کرتی رہی لیکن جب اسے پتہ چلا کہ رام لبھایا سچ مچ ڈیزی سے شادی کر رہا ہے تو اس نے گھبرا کر رام لبھایا کو ہاں لکھ دیا جو شادی کی دعوت کے روز بہانے سامنے اسے ملا۔ اب رام لبھایا کو بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ ایک طرف ڈیزی تھی، خوب صورت و دل ربا، اس کی محبوبہ، دوسری طرف نرملا تھی۔ دبلی، پتلی سانولی، لیکن سیٹھ کی بھانجی۔ رام لبھایا نے دونوں کو ترازو میں ڈالا۔ ایک پلڑے میں ڈیزی کو رکھا، دوسرے میں نرملا کو۔ ڈیزی کا پلڑا بھاری تھا۔ یکایک سیٹھ نے اپنا سارا بوجھ نرملا کے پلڑے میں رکھ دیا اور ترازو ٹوٹ گئی۔

رام لبھایا نے نرملا سے شادی کر لی ہے۔ وہ آج کل ہمارے دفتر میں ہیڈ کلرک ہے۔ سیٹھ اُس سے بہت خوش ہیں اور اسے اپنی دکان کا حصّے دار بنانے کی سوچ رہے ہیں۔ اب سب ٹھیک ہے۔ دھرم، دفتر، سماج، سب ٹھیک ہے۔ صرف مجنوں جنگل میں اکیلا ہے۔

خوشی

وہ کہنے لگا "نوکر تو نہیں، البتہ ایک نوکرانی کا ضرور بندوبست کر سکتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آئندہ سٹا میری معرفت کھیلا کریں۔"

میں نے کہا "تم مذاق کرتے ہو۔"

وہ بولا "جی نہیں۔ مذاق اور آپ سے! سچ کہتا ہوں، مجھے کمیشن ملتا ہے۔ سٹے باز جو رقم داؤ پر لگاتے ہیں، اس پر مجھے پانچ فیصد کمیشن ملتا ہے۔ اس دفتر کے سب ملازم میری ہی معرفت سٹا کھیلتے ہیں ورنہ آپ ہی بتائیے کہ جو تنخواہ مجھے یہاں ملتی ہے، اُس میں کسی بھلے مانس کا گزارا کیسے ہو سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا "اُس کی عمر کتنی؟۔۔۔ کیا۔۔۔۔ کے۔۔۔۔؟" بیس برس کے تجرّد نے مجھے بوکھلا دیا۔

وہ بولا "جی نہیں، کوئی چودہ پندرہ برس کی ہو گی۔ رنگ نہ گندمی نہ سانولا بس بیچ کا رنگ ہے، جیسے فاختہ کے سینے کا ہوتا ہے۔ بس آپ اُسے ایک فاختہ ہی سمجھیے۔"

میں نے کہا "میں شکاری نہیں ہوں۔ مجھے تو نوکر چاہیے۔"

وہ بولا "کھانا پکانا، سینا پرونا سب جانتی ہے۔ پھر آپ اکیلے ہیں۔ وہ آپ کے گھر کا سب کام سنبھال لے گی۔"

"مگر بھئی نوکرانی! لوگ کیا کہیں گے۔"

وہ ہنسا "آپ کی آزاد خیالی تو دفتر بھر میں مشہور ہے۔ اور آپ تو لوگوں کو اخلاق کا سبق دیتے ہیں اور اشتراکی بنانا پسند کرتے ہیں، دیکھئے نا، اگر اب آپ بھی؟۔۔۔ اور پھر وہ بے چاری یتیم ہے۔"

"یتیم ہے؟" میں نے ترس کھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں! اس کے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ وہ اب تک اپنے چچا کے پاس تھی۔ جب وہ تیرہ برس کی ہوئی تو چچا نے اس پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔"

"تمہارا مطلب ہے اُس کے دامنِ عصمت؟"

"جی ہاں! اس کا دامنِ عصمت پارہ پارہ کرنا چاہا۔ اُس کی زندگی کی متاعِ عزیز لُوٹ لینی چاہی۔ اس کی دوشیزگی کی معصومیت اپنی رندی و ہوس ناکی کی شکار بنانی چاہی۔ اس کی باکرہ روح کی مقدّس عفّت اپنی بہیمیت و شیطنیت۔۔۔"

میں نے کہا "یہ بکواس ختم کرو۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔"

وہ بولا "جی۔ دیکھئے نا۔ لوگ سچائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ زنا بالجبر کہہ دینا گناہِ عظیم ہے۔ دفتر کے بڑے بابو بھی کہتے ہیں اور میں مترجم ٹھہرا۔ جو وہ کہتے ہیں، اُسی طرح کرتا ہوں۔ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ میں نے یہ فعلِ شنیع اپنی زبان سے ادا کرنے کے لئے ایک سو فقرے یاد کر رکھے ہیں۔ دفتر کے بڑے بابو کہتے ہیں کہ سچّائی عریاں صورت میں کبھی پیش نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ہمیشہ لباس پہنا کر۔"

میں نے کہا "مگر ذکر تو نوکرانی کا ہو رہا تھا۔"

وہ بولا "جی نہیں۔ ذکر اس کے چچا کا ہو رہا تھا جس نے اُس پر ہاتھ صاف، یعنی میرا مطلب ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا "میں سمجھ گیا۔ آگے چلو۔"

"تو وہ اپنے چچا کے گھر سے بھاگ نکلی۔ اور اپنی موسی کے گھر آ گئی۔ یہاں موسی نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی، اُسے اچھے کپڑے پہنائے، دو چار اپنے زیور نکال کر اُسے دے دیئے۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا، اُسے اپنے سینے سے لگایا۔ کیوں جی جب عورت عورت کو سینے سے لگاتی ہے تو اس سے عریانی تو پیدا نہیں ہوتی؟"

میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے، بڑے بابو نے کسی غلط ترجمے پر تمہیں ڈانٹ پلائی ہے بہرحال، خیر، آگے پڑھو۔"

"تو صاحب" وہ بولا "لڑکی بالکل نوجوان تھی اور اس کی موسی کا خاوند ذرا آں۔۔ میرا مطلب ہے، ذرا، وہ، تھا۔ چنانچہ وہ بھی لڑکی پر عاشق ہو گیا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ موسی کا خاوند اور موسی کا بیٹا دونوں اس پر عاشق ہو گئے۔ یعنی باپ اور بیٹا دونوں بیک وقت ۔۔۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا موسی نے دو طمانچے لگا کر لڑکی کو گھر سے نکال دیا۔ اب وہ اپنے پھوپھا کے گھر پہنچی۔ پھوپھا ذرا شریف قسم کا بدمعاش تھا یعنی اُسے بڑے دم دلاسے دے کر اپنے گھر رکھا۔ اکیلا تھا وہ آپ کی طرح۔ چنانچہ جہاں اور لوگ کامیاب نہ ہوئے، وہ کامیاب ہو گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد اُس نے لڑکی کو پیشہ کرنے پر مجبور کر دیا۔"

"پیشہ کرنے پر؟"

"جی ہاں۔ آپ کو اس کا مطلب سمجھاؤں؟ یعنی اُس لڑکی کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ چند روپہلی ٹکلیوں کے عوض اپنی عصمت و عفت، اپنی تقدس مآب حیا پردر دوشیزگی یعنی اپنی متاعِ عزیز، خزینۂ حیات۔۔۔"

"خدا کے لیے،" میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا "مجھے تمہارے ترجمے سے کوئی سروکار نہیں۔"

"وہ مسکرایا "مجھے شبہ ہے کہ آپ عریاں پسند ہوتے جا رہے ہیں مسٹر۔ مجھے آپ کی عریاں پسندی سے کیا سروکار۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں، کہ اُس شریف بدمعاش پھوپھا نے اُس بدقسمت لڑکی کو بازار کی فاحشہ بن جانے پر مجبور کر دیا۔ چند مہینے اسی طرح گزر گئے پھر وہ بیمار ہو گئی، مرزا کے۔"

"سوزاک؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

وہ چڑ کر بولا "آپ بد کتے کیوں ہیں، کس شہر میں، کس گلی میں، ہندوستان کے کس گاؤں میں آپ نے اس کا نام نہیں سُنا؟ زندگی کے کس نکڑ پر آپ نے اس منحوس بیماری کا نام نہیں سُنا؟ کیا کبوتر کے آنکھیں بند کرنے سے باز حملہ نہیں کرتا؟ کیا وہ اشتہار آپ نے نہیں دیکھے۔ پیپ، جلن دو دن میں بند، وہ کون سا مکان ہے، کون سا شہر ہے، کون سا گاؤں ہے؟ سمندر سے لے کر غریب کی جھونپڑی تک وہ کون سی دیوار ہے جہاں اس خوف ناک بیماری کی پیپ اور جلن دو دن میں بند کر دینے کا ذکر نہ ہو۔ وہ کون سا شریف گھر ہے؟"

میں نے کہا "اب تم گالی دینے پر اُتر آئے ہو۔"

"چلئے نہ سہی۔ سوزاک سہی۔ یہ سمجھ لیجئے، اُسے ایک خوف ناک، شرم ناک بیماری لاحق ہو گئی، گو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کس کے لیے شرم ناک کہا جائے۔ اُس لڑکی کے لیے یا اُس شریف سماج کے لئے، جو اُس سے دن رات پیشہ کراتا ہے؟"

میں نے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے یہ وعظ سُننا پڑے گا۔۔۔"

وہ بولا "معاف کیجئے گا۔ واقعی میں بہت باتونی ہوں، جھکی ہوں، مختصر بیان کرتا ہوں۔ تو صاحب! اب وہ لڑکی وہاں سے بھاگ نکلی۔ پھوپھا اس کے پیچھے پیچھے بھاگا وہ دونوں لڑنے لگے۔ لڑکی چیخنے لگی۔ اتفاق سے میں سڑک سے گزر رہا تھا۔ اِدھر دفتر آنا تھا۔ بغل میں فائل دابے۔۔۔"

"ہیرو ہو گئے تم؟" میں نے طنزاً کہا۔

"جی نہیں" اُس نے کہا "بھلا دفتر کا مترجم کبھی ہیرو ہو سکتا ہے۔ بھلا چالیس روپے تنخواہ پانے والا کبھی ہیرو ہو سکتا ہے؟ ہاں تو صاحب! میں اُسے اُس کے پھوپھا سے چھڑا کر اپنے گھر لایا۔ یہاں میں اپنے بڑے بھائی اور بھابی اور اُن کے چھوٹے چھوٹے

بچوں میں رہتا ہوں۔ وہ لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بھابی نے میری شرافت کو سراہا اور اس لڑکی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ لیکن صاحب! اس لڑکی کی قسمت ہی بُری ہے۔ میں اگر اس لڑکی سے دو باتیں بھی کر لوں تو بھابی خفا ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ لڑکی کبھی میرا بستر بھی ٹھیک کر دے تو آگ بگولا ہو جاتی ہیں۔ اب گھر میں ہر وقت چخ چخ سی رہتی ہے سکون تباہ ہو گیا ہے۔ لڑکی کے علاج پر میں نے چند روپے کیا صرف کر دیئے۔ اب تک گالیاں پڑ رہی ہیں۔ بھابی نے آج لڑکی سے کہہ دیا ہے کہ جہاں اس کا جی چاہے چلی جائے۔ میں اسے گھر پر نہیں رکھ سکتی۔"

"تو اس لئے تم اسے میرے ہاں بھیجنا چاہتے ہو؟ ایک بدمعاش عورت کو میرے ہاں ملازم کرانا چاہتے ہو؟" میں نے غصے سے کہا۔

اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ "مجھے آپ کے معصوم چہرے اور گنجے سر نے دھوکا دیا۔ میں سمجھتا تھا، آپ کو غریبوں سے ہمدردی ہے مگر آپ محض باتیں ہی باتیں بناتے ہیں یا ان پر عمل بھی کرتے ہیں؟"

"مگر وہ لڑکی؟" میں نے شرمندہ ہو کر کہا "بیمار ہے۔ اُسے سوزاک ہے، میں اُسے کیسے؟ میں خود بیمار ہو جاؤں گا۔ تم سمجھتے نہیں، یہ چھوت کی بیماری ہے اور ... ذرا سوچو تو۔"

"سُنیئے! اب وہ اچھی ہے۔ میں نے اسّی روپے صرف کئے ہیں، اُس کے علاج معالجے پر۔ دیکھئے۔ آج بھابی اُسے گھر سے نکال دیں گی۔ میں پھر اُسے قحبہ خانے کے جہنم میں واپس نہیں بھیجنا چاہتا۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اور میری تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اُسے ایک الگ مکان لے کر دوں۔"

"ایک الگ مکان؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

وہ بولا "ہاں! میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

*

چاند میرے گھر نوکرانی بن کر آ گئی۔ میں نے کہا "چاند"

وہ بولی "جی"

"دیکھو میری عمر پینتیس سال سے کچھ زیادہ ہے۔ میرا سر گنجا ہو چکا ہے۔ میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں۔ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔ میں عورتوں سے دُور بھاگتا ہوں۔ ساڑھے تین سو روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ لوگ مجھے ازلی شریف سمجھتے ہیں، میری شرافت پر بٹہ نہ لگانا۔ مجھے زیادہ پریشان نہ کرنا۔ بال سنوار کر آنکھوں میں کاجل لگا کر مجھے دعوتِ نظارہ نہ دینا۔ بس چپکے سے گھر کا کام کاج کرتی جاؤ۔ پندرہ روپے تنخواہ اور روٹی کپڑا۔"

وہ بولی "یہ دعوتِ نظارہ کیا ہوتا ہے جی؟"

میں ہنسا "کچھ نہیں۔ میں ذرا ترجمہ کر رہا تھا۔ اب تم کچن میں جا کر برتن صاف کرو۔ صبح مجھے دو انڈے نیم برشت اور ایک گلاس دودھ کا چاہیئے۔ دوپہر کو کھانا جس میں ٹماٹر اور کدّو اور شلغم کبھی شامل نہ ہوں، سہ پہر کی چائے میں دفتر ہی میں پیوں گا۔ شام کے کھانے میں چاول ضرور ہونے چاہئیں۔ سوتے وقت میرے گنجے سر میں روغنِ بادام کی مالش تمہیں کرنی ہوگی۔ اس کے بعد تم اپنے کمرے میں سو سکتی ہو، ہاں، اندر سے زنجیر ضرور لگا لینا ورنہ میں ذمہ دار نہیں ہوں۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ چھوٹی سی لڑکی تو وہ تھی۔ وہ عورت کہاں تھی، ابھی تک نوجوانی کے سن میں بڑی مشکل سے آئی ہوگی۔ لیکن اس کا جسم نہیں اس کی آنکھیں کہے دیتی تھیں کہ اُس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ جہنم کے وہ شعلے جن کے متعلق ہمارے ہندوستانی شاعر کبھی شاعری نہیں کرتے، سماج کے وہ گھناؤنے مناظر جن کا حسن ہمارے افسانہ نگار کبھی بے نقاب نہیں کرتے، خرید و فروخت کے وہ ادارے جن کا ذکر ہمارے چیمبر آف کامرس میں کبھی نہیں ہوتا لیکن جو ہمارے پاک دور، ہمارے ہندوستان کی ہر گلی میں، ہر گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ اس لڑکی نے اپنے جسم

اور اپنی رُوح کے ہر سانس میں گھستے ہوئے، اسے اُجاڑتے ہوئے تباہ و برباد کرتے ہوئے، اُسے نوچ نوچ کر چیتے پھاڑتے ہوئے ایک بھوکے وحشی بھیڑیئے کی طرح بھنبھوڑتے ہوئے دیکھتے تھے۔ اس کی آنکھیں ابھی تک زخمی تھیں۔ اس کا اُوپر کا لب اندر بھنچا ہوا تھا۔ کسی اذیت ناک کرب کی وجہ سے اور اس کا نچلا ہونٹ ذرا آگے جھکا ہوا تھا۔ اور کسی مرد کو اپنے قریب آتے دیکھ کر تھرّانے لگتا تھا اور سینے کے خم کانپنے لگتے تھے۔

میں نے اُسے ہنسانے کی کوشش کی "میاؤں"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ کچن میں دال بگھار رہی تھی۔ پوچھنے لگی "کیا ہے"

میں نے کہا "میں بلّی ہوں، تم چوہا بلکہ چوہیا۔ ہی ہی ہی"

وہ خاموش رہی، میں شرمندہ ہو گیا اور اپنا گنجا سر کھجانے لگا۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔

ایک دن کہنے لگی "میں دُھوپ میں تمہارا کھانا لے کر آتی ہوں، میرے پاؤں جلتے ہیں"

میں نے اُس کے گندے، گرد و غبار میں اَٹے ہوئے پاؤں پر نظر ڈال کر کہا "ارے ارے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا"

میں نے اُسے بازار سے ایک جوتی خرید کر دی۔ اور سفید دھوتیاں جن کے کنارے رنگین تھے۔ اپنا گنجا سر چھپانے کے لئے میں ایک سمور کی ٹوپی لایا، ایک سینٹ کی شیشی، کریم اور اُس کے لئے ہیئر کلپ۔ جب بھی وہ نہ مسکرائی۔

پورے ایک ماہ بعد میں نے اُسے پندرہ روپے دیئے "لو! یہ تمہارے ہیں۔ انہیں تم جس طرح چاہو خرچ کر سکتی ہو" اُس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر آنکھیں جھکا کر پیسے لے لئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور بھی زیادہ اُداس ہو گئی ہے "چاند" میں نے کہا "کیا بات ہے؟"

درجی کچھ نہیں۔"

رات کو وہ میرے گنجے سر پہ روغن بادام کی مالش کر رہی تھی، کہنے لگی "کیا آج رات مجھے یہاں سونا ہوگا؟"

میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا "کیوں؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟ میں نے تم سے؟۔۔۔"

وہ کہنے لگی "آج صبح آپ نے مجھے پندرہ روپے جو دیئے تھے" میں کانپنے لگا۔ وہ بولی "پھوپھا مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستر پر سو جانے کے لئے مجبور کرتے تھے اور پھر مجھ سے سب روپے بھی چھین لیا کرتے تھے۔ آپ بھی اگر مجھ سے روپے چھیننا چاہتے ہو تو ابھی واپس لے لو۔"

میں نے کہا "تمہیں یہ شبہ کیسے ہوا؟"

وہ بولی "تو آپ یہ روپے مجھ سے واپس نہیں لیں گے؟"

"اور۔ اور مجھے۔۔۔" اُس نے اشارہ کر کے کہا "یہاں بھی نہ سُلائیں گے؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔ تم کیوں اس طرح۔۔۔" وہ چپ چاپ اُٹھ کر چلی گئی۔ اُس کی آنکھیں حیران تھیں۔

ایک دن وہ کچن میں بیٹھی، شیشہ سامنے رکھے، بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اور ایک گیت گا رہی تھی۔ کچھ عجیب سا گیت تھا فحش، بازاری لیکن اس میں بھی عورت نے مرد کے خلاف اور سماج کے خلاف جو مرد کا سماج ہے، اپنا غم بیان کیا تھا۔ اک عجیب سا گیت تھا جس کے الفاظ اجازت نہیں دیتے کہ اُسے یوں ادب کی زبان میں بیان کیا جائے۔ اس گیت کا ترجمہ بہت ہی مشکل ہے۔ وہ گیت تھا، ایک بازاری عورت کی گالی بھی تھی جو اس نے جل کر مردوں کے خلاف بکی تھی۔ اور چاند اسے آہستہ آہستہ نفرت کے احساس سے متاثر ہو کر گا رہی تھی۔ یہ گیت رات کے اندھیرے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ گیت قحبہ خانے کی غلام فضا میں اُجاگر ہوا تھا۔ یہ گیت صدیوں کے ظلم و ستم، جبر و استبداد کے خلاف عورت کی مسکی، کچلی، زخمی رُوح کا احتجاج تھا۔ ایک موٹی مسلسل سی گالی لیکن احتجاج کی رُوح تو پاک صاف

۔ اُس کا غم اور غصّہ تو شعلے کی طرح کندن تھا۔ گیت اچھّا تھا لیکن ماحول نے اُسے غلیظ سانس عطا کی تھی۔ اُس مفلس و نادار دوشیزہ کی طرح جو اپنی معصومیت ے چیتھڑوں میں چھپائے ہوئے ہو۔ " چاند! کیا گا رہی ہو ؟" میں نے شرارت سے پوچھا ، چپ ہو گئی۔ " چاند "!

وہ بولی " جی کچھ نہیں "

اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ اُوپر کا لب اندر بھینچا ہوا تھا اور نچلا لب ذرا آگے جُھک کر کانپ رہا تھا۔ اور دانتوں کی لڑی بیچ میں جھلک رہی تھی۔ مجھے اس وقت وہ اس بے بس ہرنی کی طرح نظر آئی جو چاروں طرف سے نا اُمید ہو کر ایک کونے میں آ کر کھڑی ہو گئی ہو، آخری مدافعت کے لئے۔

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے، وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے، آج کل وہ تمہارے لئے بہت سٹّا کھیلتا ہے۔ شاید اُس کی قسمت پھر جائے اور وہ تمہارے لئے ایک گھر لے سکے۔"

وہ کہنے لگی " پھوپھا کے ہاں ہر مرد یہی کہا کرتا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا؟" اُس نے آئینہ اُٹھا کر دیا اور کنگھی بھی زمین پر رکھ دی۔

اُس روز قیمے کے پراٹھے اور مرچوں کا اچار اور مکھّن دسترخوان پر تھا۔ اور ہم لوگ کھا رہے تھے۔ میں اور چاندا اور وہ۔ چاند کی صحّت اب پہلے سے بہت بہتر تھی اور گالوں پر ہلکی سی سُرخی آ گئی تھی۔ جیسے پکتے ہوئے آٹے کی جلد ملائم پڑ گئی ہو۔ جسم گدرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں کی حزیں چمک بھی اس قدر اُداس نہ تھی۔ پھر بھی لبوں پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔ ، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ لڑکی اب کبھی مسکرا نہیں سکتی ؛ جیسے یہ لڑکی اب کبھی عورت نہیں بن سکتی۔ جیسے یہ چاند ہمیشہ کے لئے گہنا گیا ہے۔ جیسے اس روح کو کبھی قرار، سکون، اعتماد اور محبّت عطا نہیں ہو سکتی۔ جیسے یہ زندگی کبھی خوشی، مسرّت اور بہجت سے معمور

نہیں ہو سکتی۔ جیسے یہ حیات اُس مرمریں ٹھلیا کی طرح ہے جس میں لوگوں نے جا بجا سوراخ کر دیئے ہوں۔ اِدھر پانی ڈالو، اُدھر غائب۔ اس خالی گیت کو جو ایک تلخ گالی تھا، اب کوئی خوشی سے معمور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دسترخوان پر بیٹھی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے اُسے اپنے ساتھ دسترخوان پر شریک کیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی موجود تھا۔ لیکن چاند کو اس عزت افزا کا مطلق احساس نہیں تھا۔ نہ ہمارے ساتھ بیٹھنے کی خوشی تھی۔ قیمے کے پراٹھے اور مکھن کی ڈلی اُسے مرعوب نہیں کر سکی۔ رنگین کنارے والی دھوتی اور اونچی ایڑی کا سینڈل کی خوشی بھی نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ اور ہم لوگ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے کام لے کر اُسے ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ بالکل ٹھس بیٹھی تھی۔ خاموش اداس، پژمردہ۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ سماج کے عفریت کا گناہ، عصمت دری سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس کی عصمت چھن جانے کا مجھے اتنا افسوس نہیں تھا۔ ہر عورت کی عصمت ایک دن چھن ہی جاتی ہے۔ اپنے خاوند کے ہاتھوں یا کسی غیر مرد کے ہاتھوں۔ افسوس تو یہ تھا کہ سماج نے اس چودہ برس کی لڑکی کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔ اس کا اعتماد چھین لیا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی ہنسی چھین لی تھی۔ اور جب کسی انسان سے اس کی ہنسی چھین لی جائے تو اُس سے بڑھ کر بدقسمت فرد کوئی نہیں ہو سکتا۔

کھانا کھا کر مجھے گہری نیند آئی۔ جب آنکھ کھلی تو چھ بجے تھے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ لیکن دُھوپ بالکل ماند پڑ گئی تھی اور سائے گہرے ہو گئے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چل رہا تھا۔ میں آہستہ سے اُٹھا۔ کیونکہ سٹے بازوں کا دلال ابھی تک غالیچے پر چت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ سونے دو کم بخت کو۔ اُسے کیا معلوم، بہار کسے کہتے ہیں۔ کھڑکی کھول کر دیکھا تو شمال سے بادلوں کے پرے کے پرے صف باندھ کر چلے آ رہے تھے۔ میں نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "آہا۔ آج بارش ہو گی۔ جب گنجے سر پر بارش کی پہلی بوندیں پڑتی ہیں تو روح کو وہ بالیدگی حاصل ہوتی ہے جو قیمے کے پراٹھے کھانے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

یقین نہ آئے تو سر منڈا کر دیکھیے۔ اولوں سے بچیے لیکن بارش کی بوندیں اپنے سر پر برس جانے دیجیے۔ تراوٹ حاصل ہوتی ہے۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور غسل خانے کی طرف جانے لگا۔ غسل خانے کے باہر پتھر کے چبوترے پر چاند بیٹھی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں طشتری تھی اور طشتری میں آم کی کیری کے قتلے سُرخ مرچ اور نمک اور نیبو کے رس میں پڑے ہوئے تھے وہ مجھے دیکھ کر ایک چور کی طرح جھینپی۔ میں نے کہا "مزے دار ہیں؟"

"بے حد۔ کھاؤ گے؟"

میں نے سر ہلا دیا۔ اُس نے ایک قتلہ مجھے دیا۔ وہ میرے بالکل قریب آگئی۔ آہستہ سے کہنے لگی "میں نے پتھر مار کر اُس پیڑ پر سے یہ امبلیاں توڑی ہیں۔ بے حد مزے دار ہیں نا؟"

"ہوں۔ ہوں۔" میں نے کھاتے ہوئے کہا "کیسے چٹپٹے اور مزے دار ہیں۔"

یکایک وہ مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے بڑھ کر اس کے سارے چہرے پر، سارے جسم پر، ساری فضا پر پھیلتی گئی۔

اُس کا اوپر کا ہونٹ جو اندر بھنچا ہوا تھا، آہستہ سے نرم پڑتا گیا اور اپنی اصلی حالت پر آتا گیا۔ اُس کا غم پُرانا تھا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ پُرانی نہیں تھی، نئی تھی، نوجوان تھی، خوبصورت تھی، معصوم اور غیر ملوّث تھی۔ اُس حیا پرور کلی کی طرح جو کھلنا چاہتی ہو۔ اور پھر شرما کر پردوں کی اوٹ میں چھُپ جانا چاہتی ہو۔ لیکن اب یہ مسکراہٹ کھلتی گئی گیت نے اپنا غلیظ لباس اتار پھینکا۔ اور اُس کے جسم میں خوشی کا نغمہ بہنے لگا۔ ہم دونوں ہنسنے لگے۔ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ میں نے کہا "کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ ایک پتھر اور مارو امبیاں تو بڑی مزے دار ہیں۔" اُس نے پتھر اُٹھایا اور اُس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

✱

"یہ تم نے کیا کیا؟ اُسے اپنے گھر بھیج دیا؟"

میں نے کہا "میں نے اپنی ماں جی کو لکھ دیا ہے کہ چاند میرے ایک عزیز دوست

کی منگیتر ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ وہ چاند کی دل جوئی کریں گی۔"

"لیکن وہ وہاں خوش رہ سکے گی؟"

میں نے کہا "میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ وہاں اُس سے کوئی عشق کرنے والا نہیں ہے۔ چاند کو اب عشق کی ضرورت نہیں ہے، اُسے رنگین دھوتیوں اور سینڈلوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ خوشی قیمے کے پراٹھوں میں بھی نہیں۔ اور دستر خوان پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانے میں بھی نہیں اور اُس سے ازراہِ ترحم شادی کرنے میں بھی نہیں۔ ان چیزوں سے اُس کی مسکراہٹ اُس کی خوشی لوٹ کر نہیں آسکتی۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے اُس کی بات سُنی اَن سنی کرکے کہا "میں گنجا ہوں اور تم اندھے فلسفی ہو اور دنیا ناپاک پھوہڑ بھاؤں سے بھری ہوئی ہے۔ ذرا اُسے میری ماں کی ممتا اور شفقت کی چھاؤں میں دم لینے دو۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے معصوم قہقہوں سے اپنے زخموں پر مرہم لگانے دو۔ اُسے ہنسنے دو اور اسے بھول جانے دو۔"

یکایک وہ سمجھ گیا اور دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر میری گنجی چاند پر چٹکی لے کر بولا "تم کورے جذباتی ہو۔ میرا شبہ درست نکلا۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری عقلیت کے پسِ پردہ جذبات ہے۔ کون تھی وہ جس نے تمہیں یہ کرب ناک شخصیت عطا کی؟ جس نے تمہاری آنکھوں کا نور چھین لیا۔ جس نے تمہارے گھنے بالوں کے جنگل اُجاڑ دیئے۔ جس نے تمہاری مسکراہٹ میں یاس و قنوط کی تلخی جھلکا دی؟ کون تھی وہ؟"

میں نے کہا "زندگی ایک جُوا ہے۔ یہ بتاؤ، آج سٹے میں کیا لگے گا؟ نو سے دو یا پانچ سے سات؟"

بس اسٹاپ

یوں دیکھنے میں اطہر خوبصورت نہیں تھا۔ وہ قبول صورت بھی نہیں تھا بلکہ خاصا بدصورت تھا۔ گہرے سانولے رنگ پر ذرا کم سانولے رنگ کی چھائیاں۔ آنکھیں اس قدر چھوٹی تھیں کہ اس کے چوڑے سے چہرے پر جیسے اُبلی پڑتی تھیں۔ کوتاہ قد گردن، کوتاہ پیشانی، مگر قسمت دھنی تھا جب دیکھو کوئی نہ کوئی جون، گلے ڈیئر، سدھا یا ثریا اس کے بازو کے زاویے میں اٹکی ہوئی دکھائی دیتی۔ اطہر کو دراز قد لڑکیاں چھریری لڑکیاں، لڑکوں کا سا جسم رکھنے والی لڑکیاں پسند نہیں تھیں، گول مٹول سا چہرہ ہو، رنگت زیتونی ہو، قد ٹھگنا سا ہو، جسم فربہی مائل ہو، یعنی بھری بھری شاداب لڑکیاں ہوں تو اطہر ان پر بے دھڑک مرنے لگتا تھا اور قسمت کی بات ہے کہ اسے اکثر اپنی پسند کی لڑکیاں مل جاتی تھیں۔ اس کی صورت شکل دیکھ کر یہ ایک معجزہ [illegible] مگر لڑکیاں خود اپنے حسن میں اس قدر ڈوبی رہتی تھیں کہ وہ نصیب اپنے ہمراہ مردوں کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ لطیف کو بھی حسین تو نہیں کہا جا سکتا، ہاں چہرے پر ایک خاص قسم کے وقار اور وجاہت کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ خود دراز قد تھا۔ اس لئے اپنے روبرو کسی دراز قد حسینہ کو دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ مگر قسمت میں وہ کچھ ایسی "خشک سالی" لکھوا کر لایا تھا کہ ہزار کوشش پر بھی کوئی لڑکی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی تھی۔ جانے اس کمبخت اطہر کی بدصورتی میں کیا جادو تھا

پچھلے چار مہینے میں اطہر نے چھ لڑکیاں بدلی تھیں۔ جب لطیف کسی نئی لڑکی کو اطہر کے ساتھ چپکے دیکھتا تو اپنا دل مسوس کر رہ جاتا۔

ایک دن اس نے بڑی کڑوا کر کے اطہر سے پوچھ ہی لیا۔ "یہ گلے ڈیئر تمہیں کہاں ملی تھی؟"

"بس اسٹینڈ پر۔"

"اور جون؟"

"بس اسٹینڈ پر۔"

اور سدھا سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی؟"

"بس اسٹینڈ"

"اور وہ نئی دل آرام جس کی کمر میں ہاتھ ڈالے تم کل شام گھوم رہے تھے؟"

"وہ بھی ایک دن بس اسٹینڈ پر مل گئی تھی اس کا نام میگی ہے"

"تمہیں سب ہی لڑکیاں بس اسٹینڈ پر ملتی ہیں کیا؟" لطیف نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

"یوں تو لڑکیاں ہر جگہ پائی جاتی ہیں" اطہر نے اپنا فلسفہ بیان کرنا شروع کیا۔ "مثلاً لڑکیاں اسکول میں ہوتی ہیں۔ کچی عمر کی بچیاں جن پر زیادہ توجہ دینا خطرے سے خالی نہیں۔ لڑکیاں کالج میں بھی پائی جاتی ہیں مگر جس دن رومانس شروع ہوتا ہے۔ اس کے دوسرے دن شادی کا مطالبہ کرنے لگتی ہیں۔ گلی محلے میں بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔ مگر ابا اماں دوربین لگائے دیکھتے رہتے ہیں کہ کہیں میلوں تک کوئی لڑکا نوجوان کی لڑکی کی تاک میں نہیں ہے؟ بس اسٹینڈ پر ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا، وہاں زیادہ تر شادی شدہ لڑکیاں ملتی ہیں یا ایسی کنواری لڑکیاں جو کسی آفس میں کام کرتی ہیں اس لئے مردوں کی نگاہوں اور ان کی انگلیوں کے اچانک لمس اور اس لمس کی بیقرار فرمائش سے آگاہی رکھتی ہیں اس لئے بس اسٹینڈ پر اولین مرحلوں میں زیادہ وقت برباد نہیں ہوتا۔ شادی شدہ عورتوں کے چہرے پر ان میں زیادہ نہیں رکتا۔ شادی شدہ عورتیں عموماً اپنے نخیلے، چھپانے، ساڑھی باندھنے کے بے پرواہ انداز اور نگاہوں کے اطمینان سے پہچانی جاتی ہیں، جیسے انہوں نے اپنے چہرے پر "ہاؤس فل" کا بورڈ لگا رکھا ہو۔ وہاں زیادہ دیر رکنے سے حاصل بھی کیا ہے۔ مگر وہ جو اکیلی ہیں، اور غیر شادی شدہ ہیں، اور تمدہ میک اپ کئے ہوئے ہیں اور تراوٹ مچھلی کی طرح گداز ہیں اور کسی کانٹے کی منتظر ہیں، ان کے ساتھ کھیلنے میں سچ مچ مزا آتا ہے"

"مگر تمہاری ٹیکنک کیا ہے؟" لطیف نے بےحد دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہر لڑکی کے لئے الگ ٹیکنک ہوتی ہے اور وہ اس کی شخصیت اور طریقۂ فکر کے مطابق ہونا چاہئے۔ اس کے لئے خاموش مطالعہ اور زیرک ذہن کی ضرورت ہے، جس کی تم میں کمی نہیں،

ہر نے لطیف کو سمجھایا۔ "ضرورت ہے تو تھوڑی سی جرأت کی، میں نے دیکھا ہے، عورتیں جرأت کو
۔ پسند کرتی ہیں۔ وہ مہم آمیز کوشش پر جان دیتی ہیں، انھیں شکار بننا بہت پسند ہے مگر قابو
آنے سے پہلے چوکڑیاں بھی بہت بھرتی ہیں۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔" اطہر نے گھڑی دیکھ
ہا۔ "نکہت سے ملنا ہے۔"

"نکہت کون؟" لطیف نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کل تک تو میگی تھی۔"

"آج صبح بس اسٹینڈ پر ملی تھی۔ میں شکل دیکھتے ہی پہچان گیا۔ بامبے فرائینگ پین کے
شتہار میں جس لڑکی کو دکھایا جاتا ہے وہ نکہت ہی ہے اور یہی پہچان ہماری پہلی ملاقات کا
ث بنی۔ تم اخبار میں اشتہار نہیں دیکھتے کیا؟"

لطیف بولا۔ "اخبار تو میں خبروں اور سیاسی تبصروں کے لئے پڑھتا ہوں۔"

"آئندہ سے اشتہار بھی دیکھا کرو۔ آج کل کی خوبصورت لڑکیوں نے ایک نیا
یہ اختیار کیا ہے۔ ماڈلنگ! بائی بائی۔"

اطہر چلا گیا تو لطیف دیر تک جلتا بھنتا رہا۔ پھر اس نے بلڈ پریشر کم کرنے کے
ئے ایک گلاس جوس پیا۔ پھر اس نے سوچا۔ اطہر کی باتوں میں وزن ہے تو محض جلنے بھننے سے کیا
صل؟ خود تو کوئی لڑکی اس کے پاس آنے سے رہی۔ بس ٹھیک ہے۔ کل سے سکوٹر کو تالا لگا دوں
ور بس اسٹینڈ پر کھڑا رہوں گا۔

دوسرے دن لطیف بس اسٹینڈ پر کیو میں کھڑا تھا۔ اس کے بالکل آگے ایک بوڑھی
ین پھول دار سلک کی ساڑھی پہنے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ کچھ گرمی سے کچھ دور پیدل چل کر آنے
کچھ موٹاپے سے، کچھ ممکن ہے یونہی ہانپ رہی ہو۔ کچھ لوگوں کو ہانپنے کا شوق بھی ہوتا ہے۔ لطیف
پیچھے نگاہ ڈالی تو تین عدد کلرک جیسے بیحد مضطرب اور خفا نظر آئے۔ بس بھی تو غضب کی
ئیں دکھاتی ہے۔ بالکل کسی حسین عورت کی طرح۔ کیا مجال جو وقت پر آ جائے۔ پھر لطیف
، آگے جھانکا تو ایک بوسیدہ سیاہ کوٹ پہنے ہوئے وکیل نظر آیا۔ اس کے قریب سیاہ فیتہ
دھے ہوئے عالمی چہرے والا ایک کرسچن۔ اس کے آگے پہلوان ٹائپ دادا۔ اس کے آگے

ہاں، اس کے آگے وہ کافر ادا کھڑی تھی۔ جس پر بار بار نظر ڈالی جا سکتی تھی۔ خدا کا شکر تھا کہ آگے کھڑی تھی۔ پیچھے کھڑی ہوتی تو بار بار پلٹ کر دیکھنے سے کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو شبہ ہو خدا کس قدر کارساز ہے کہ اس نے اس پری رُخ کو کیو میں آگے جگہ دی۔

وہ دلربا اپنے سیاہ کٹے ہوئے بالوں کو بار بار جھلاتی تھی ان بالوں میں کیسے خوبصور لہریئے تھے جو اس کی لانبی گردن تک جھُول جھُول جاتے تھے۔ ریشمی پلکوں کے سائے میں بڑی خوابیدہ سی آنکھیں، سُرخ و سپید رنگت۔ بوٹا سا قد۔ لطیف کا دل دھڑکنے لگا۔ ا دلربا اور اس کے درمیان چار افراد کا فاصلہ تھا۔ کیو کے اندر فاصلا انچوں یا گزوں کے حساب سے نہیں بلکہ افراد کے حساب سے ناپا جاتا ہے۔ دیکھئے قسمت کیا رنگ دکھاتی ہے۔ یعنی بس کیا عشوہ طرازی دکھاتی ہے۔ اگر بس میں زیادہ جگہ نہ ہوتی یا آگے کھڑے ہ والے افراد ایک ہی نمبر کی بس میں سوار ہونے والے نکلے تو لطیف کو مشکل ہی سے اس کا ساتھ میسر آئے گا۔ اس پری جمال کا ساتھ نصیب ہوگا یا نہیں؟۔ لطیف دل ہی دل ٹاس کر رہا تھا کہ اتنے میں بس آگئی اور دلربا اس میں بیٹھ گئی۔ پھر وہ پہلوان ٹائپ دادا ماتمی فیتے والا کرسچن پیچھے ہٹ گئے وکیل اور بوڑھی پارسن نے بھی اس میں سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ آج قسمت زوروں پر ہے، لطیف نے سوچا اور جلدی سے بس میں گھس گیا اور جہاں وہ مہ وش بیٹھ رہی تھی۔ وہیں اس کے برابر کی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ خوشبو کا ایک مہکتا ہوا بھبھکا شامِ جاں کو تازہ کر گیا۔

لڑکی نے یاقوتی رنگ کی بیل باٹم پہن رکھی تھی جس سے اس کے کولھے کے خم کی کریم کلر بیل باٹم میں فٹ رہے تھے بس کی سیٹوں میں اتنا فاصلہ تو ہوتا نہیں کہ دو ہمسفر ایک دوسرے سے الگ الگ بیٹھ سکیں، اس لڑکی نے کوشش تو بہت کی لیکن اگر کولھے بھاری ہوں تو لڑکی کیا کرے۔ وہ صرف اپنے چہرے کا پسینہ پونچھ سکتی ہے اس نے ایسا ہی کیا تو اس کے ہاتھ سے بٹوہ چھوٹ گیا۔ لطیف نے فوراً جھک کر بٹوے

کو بلکہ اس موقع کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا۔ لڑکی نے بٹوہ لے کر ایک لجاتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا، ایک ایسے دھیمے سنگیت بھرے لہجے میں جس سے لطیف کو وہ لائٹر یاد آ گیا جس کا بٹن دبانے سے نہ صرف سگریٹ سلگتا ہے بلکہ سنگیت کی ایک دُھن بھی بجتی ہے۔ یہ لڑکی بھی کوئی ایسا ہی شعلہ ساماں لائٹر معلوم ہوتی ہے، مگر کوئی اُس سے اپنا سگریٹ کیسے سلگائے؟

دو بس اسٹاپ تک ان دونوں کے درمیان گہری خاموشی حائل رہی۔ لطیف نے سوچا، ایسا موقع پھر ملنے والا نہیں ہے۔ اگر اگلے بس اسٹاپ پر یہ حسینہ اتر گئی تو کیا ہوگا؟ اس سے پہلے ہی اُسے اس موقع کو کیش کر لینا چاہیئے۔ دنیا میں ہر چیز کو کیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چاہے وہ گنّے کا رس ہو، عورت ہو۔ چاندی کی گھڑی ہو یا کوئی مہکتا ہوا جذبہ ہو۔ اگر کیش نہیں ہوتا تو بیکار ہے۔

آخر لطیف نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ "آپ چرچ گیٹ جا رہی ہیں۔"

"نو"

"گرانٹ روڈ؟"

"نو"

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"نو"

اس پر لطیف اس طرح خاموش ہو گیا جیسے انگریزی زبان میں شٹ اپ ہونا کہتے ہیں۔ بڑی کھُردری زبان ہے۔ مشکل ہی سے کوئی لطیف کلمہ اس زبان کو بولنے والی عورتوں کے مُنہ سے نکلتا ہے۔ جب سنو "نو، نو" "شٹ اپ" "یو سلی ! "۔ ایک معمولی سا "یس" کہتے ہوئے جان جاتی ہے۔ معلوم نہیں ایسی کھُردری زبان ساری دُنیا میں کیسے پھیل گئی۔ شاید اس لئے کہ لوگ تاجر اور غیر رومانٹک ہوتے جا رہے ہیں۔

ورنہ وہ اس وقت اس لڑکی کے کان میں غالب کا یہ شعر ضرور گنگنا بیٹھتا:

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خُدا
افسونِ انتظارِ تمنّا کہیں جسے!

مگر یہ "نو"، بولنے والی، بیل باٹم پہننے والی اور "سی تھرو" بلاؤز کے اندر نوکدار برا پہننے والی لڑکی غالب کو کیا سمجھے گی؟ چپ رہنا ہی بہتر ہے۔

اب بتلائیے "نو" کہنے سے کیا حاصل؟ وہ چرچ گیٹ پر ہی اُتری۔ بس سے اترتے وقت لطیف نے اس کے کولھے میں چٹکی لی۔ اس لڑکی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا مگر لطیف بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔

دو دن کے بعد وہ قاتل ادا لطیف کو پھر اسی بس اسٹینڈ پر مل گئی۔ پہلے اس کی نگاہوں میں پہچان کی چمک پیدا ہوئی۔ پھر اس نے مُنہ موڑ لیا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ آج پھر ان دونوں کو اتفاق سے ایک ہی سیٹ پر جگہ مل گئی۔ لڑکی کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک بہت بڑا لفافہ تھا۔ جسے وہ سنبھالنے میں خاصی ناکام ہو رہی تھی۔ کبھی ایک بچے کی طرح اسے اٹھا کر اپنے دائیں شانے پر رکھتی، کبھی اپنے سینے سے چپکاتی۔ آخر اس نے اس لمبے چوڑے لفافے کو اپنے گھٹنوں پر اس طرح رکھ لیا کہ آدھا لفافہ اس کے گھٹنوں پر تھا۔ آدھا لطیف کے گھٹنے پر۔ دونوں کے گھٹنے اس لفافے سے ڈھک گئے۔

چند منٹ تو لطیف خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ "لائیے، آپ کے اس لفافے کو میں سنبھالے لیتا ہوں۔ چرچ گیٹ پر آپ کو واپس دیدوں گا۔"

"نو"

"آپ کو "نو" کے سوا انگریزی کا کوئی دوسرا لفظ بھی یاد ہے؟" لطیف نے پوچھا۔

اس پر وہ مسکرائی۔ بولی کچھ نہیں۔ لفافہ بھی لطیف کے حوالے نہیں کیا۔

پھر کوئی دس بارہ منٹ سکوت میں گزرے۔ آخر لطیف نے بہت آہستہ

سے اپنا ہاتھ لفافے سے ڈھکے ہوئے اپنے گھٹنے سے سرکا کر اس لڑکی کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ پھر ٹٹول کر گھٹنے پر ——— رکھے ہوئے اس لڑکی کے ایک ہاتھ کو پکڑ لیا۔ لڑکی نے ہلے جلے، تور مچائے بغیر اپنا ہاتھ چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ایک نازک بدن لڑکی تھی۔ اور مرد کا ہاتھ مضبوط تھا۔ لڑکی شرم سے لال لال ہوتی گئی۔ اس کے ہونٹ کانپے، مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کا ہاتھ لطیف کے ہاتھ میں ڈھیلا پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد لطیف نے اپنا ہاتھ آہستہ سے ہٹا لیا۔ لڑکی ایک گہرا سانس لے کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

لطیف نے سوچا، آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

دوسرے دن لطیف کو وہ پھر نظر آئی۔ مگر آج اس کے اور لطیف کے درمیان دس افراد کا فاصلہ تھا۔ پھر بھی لڑکی نے اسے پہچان لیا اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا اور ریشمی پلکیں رخساروں پر جھک گئیں۔ آج بہت سی باتیں ہوں گی۔ لطیف نے سوچا، اگر بس میں اس کے ساتھ جگہ مل گئی۔ مگر آج قسمت نے لطیف کا ساتھ نہیں دیا۔ لڑکی اپنی بس میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد پانچ اور افراد بس میں چڑھے۔ پھر کنڈکٹر نے گھنٹی بجا دی۔

یہ ان دونوں کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد لطیف نے اس لڑکی کو بس اسٹینڈ پر بہت دنوں تک نہیں دیکھا، تو اس نے ایک اور لڑکی سے دل لگا لیا۔ کیا کرتا؟ یہ دنیا خود ایک بس کا کیو ہے۔ پرانے جاتے رہتے ہیں، نئے آتے رہتے ہیں۔ امیدوں کا سفر جاری رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں کنڈکٹر گھنٹی بجا دیتا ہے۔

یہ لڑکی دراز قد تھی۔ دو تین دن میں ہی وہ لطیف سے گھل مل گئی۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب اپنائیت تھی، جیسے وہ اسے ایک عرصہ سے جانتی ہو۔ اور وہ بھی اس کے چہرے کو دیکھ کر محسوس کرتا تھا کہ جیسے اس نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں؟ اسے کچھ یاد نہ آتا تھا۔ ممکن ہے کبھی کسی چہرے میں کسی دوسرے چہرے کی مماثلت اپنے آپ آجاتی ہو۔ مگر اس لڑکی میں ایک نقص تھا۔ یہ لڑکی گونگی تھی۔ پہلے دن جب لطیف نے اس کا نام پوچھا تو اس لڑکی نے مسکرا کر اپنے بٹوے سے ایک بڑی سی ڈائری نکالی اور اس پر ایک

خالی صفحے کے شروع میں اپنا نام لکھ دیا۔ اور یہ بھی لکھ دیا کہ وہ گونگی ہے۔

لطیف کے دل کو دھچکا سا لگا، مگر پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ گونگی ہے تو کیا ہوا؟ دراز قد تو ہے، خوبصورت تو ہے۔ دلکش فگر والی تو ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ "یس گرل" ہے۔ اس پہلی لڑکی کی طرح "نو گرل" نہیں ہے۔ یوں بھی اگر عورت نہ بولے تو زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح لطیف نے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔ کون سا اُسے اس لڑکی کے ساتھ فلسفے کے مسائل پر بحث کرنا ہے۔ اپنے مطلب سے کام رکھو میاں۔ دو دفعہ بس میں ملاقات ہوتی۔ ایک دفعہ وہ اسے پکچر دکھانے لے گیا۔ ایک مرتبہ جوہو کے ساحل پر پام کے مور پنکھوں سے ڈھکے ہوئے ایک ہوٹل میں، جہاں دس روپے فی گھنٹے کے حساب سے کمرہ ملتا ہے۔

کمرے میں لطیف نے ایکدم بے قابو ہو کر اس راحت جاں کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ لڑکی نے مسکرا کر اُسے ایک ادائے خاص کے ساتھ پیچھے ہٹا دیا۔ پھر آئینے کے سامنے بیٹھ کر کولہوں تک آتے ہوئے اپنے بالوں کو نعرہ لطف نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اب وہ صرف پیٹی کوٹ اور برا پہنے ہوئے تھی۔ پھر اگلے ، ، اس لڑکی نے جلدی جلدی اپنے لمبے بال اتار کر الگ ڈال دیئے۔ اپنا فوم ربڑ کا برا اور پیٹی کوٹ اتار کر پھینک دیا۔ اب وہ اپنی قدرتی حالت میں لطیف کے سامنے کھڑی تھی۔

لطیف کے مُنہ سے ایک دبی دبی سی چیخ نکلی، کیونکہ اب اس کے سامنے کوئی لڑکی نہیں، ایک لڑکا کھڑا تھا۔

چند لمحوں تک لطیف سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر وہ کا ایک عجیب انداز میں مسکرایا اور لطیف کی طرف آگے بڑھنے لگا۔ لطیف پیچھے ہٹنے لگا تو اس لڑکے نے لطیف کے منہ پر زور کا ایک گھونسہ جڑ دیا۔

جب لطیف ہوش میں آیا تو اس نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ اسکا جگری

دوست اطہر اپنی نئی گرل فرینڈ نبیلا کو ساتھ لئے اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" اطہر نے اپنے دوست سے پوچھا۔

لطیف دانت پیس کر بولا۔ "وہ بدمعاش اس پہلی لڑکی کا سگا بھائی تھا، جس کا میں نے تین دن پیچھا کیا تھا۔ اس لڑکی نے اپنے بھائی سے میری چھیڑ چھاڑ کی شکایت کر دی۔ اس پر اُس کمبخت نے مجھ سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کی خاطر یہ چال چلی۔"

"مگر اُسے گونگا بننے کی کیا ضرورت تھی؟" اطہر نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اس نوجوان کی آواز اس قدر بھاری تھی کہ اگر وہ بولتا تو مجھے فوراً شبہ ہو جاتا۔ اسی لئے اس نے یہ ڈھنگ اختیار کیا۔ کمبخت نے میری وہ پٹائی کی ہے، وہ پٹائی کی ہے کہ مجھے کم سے کم بیس روز ہسپتال میں رہنا پڑے گا۔"

لطیف کی آواز میں گہری افسردگی تھی، مگر اطہر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ لطیف کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ "گھبراؤ نہیں میرے دوست شروع شروع میں ایسا گھپلا ہو سکتا ہے۔ دو ایک دفعہ میں بھی پٹتے پٹتے بچا ہوں۔ مگر ہمت نہ ہارو میری جان۔ بس اسٹینڈ معاشقے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ اب اس سرخ بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی ہی کو دیکھ لو جو میرے ساتھ ہے۔ یہ بھی مجھے بس اسٹینڈ پر ملی تھی!"

جُولی

وہ لوگ جُولی گیکاں کی لاش لا رہے ہیں۔ اولڈ یاٹ کلب کے پانٹوں کے کنارے کھڑے ہوئے مرد اور عورتوں کے جمگھٹے میں کسی نے کہا اور لوگوں کی نظریں دُور سامنے سمندر سے لوٹنے والی دو موٹر کشتیوں پر جم گئیں۔ کنور یادور سنگھ کا چہرہ فق تھا اور اس نے اپنے دل کی بے چینی چھپانے کے لئے دُوربین اپنی آنکھوں سے لگا رکھی تھی۔ دُوربین اور ہاتھ نے اُس کا چہرہ کافی حد تک چُھپا رکھا تھا پھر بھی اُس کی چھوٹی باریک کتری ہوئی مونچھوں کے نیچے اُس کے ہونٹ بار بار کانپ اُٹھتے تھے۔ اُس کے قریب راجکماری نرملا اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی، وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی اس لئے کہ اتنے بڑے جمگھٹے میں بے ہوش ہونے کے لئے جگہ کہاں تھی۔

پھر کنور یادور سنگھ نے دُوربین اپنے چہرے سے ہٹالی، راجکماری نرملا کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا پھر پلٹ کر کلب کے اندر جانے لگا۔ راجکماری نرملا بھی اپنے بحد نفیس کٹے ہوئے بال ہولے ہولے سہلاتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں نے پلٹ کر اُن دونوں کی طرف دیکھا۔ راجکماری نرملا کے حُسن و جمال کا شہرہ دُور دُور تک تھا۔ ایسی چھوٹی پیاری سی ناک تھی اُس کی کہ سارے بمبئی میں کسی خوش جمال عورت کے پاس نہ ہوگی اور اُس کی پیاری کلاسیکی ناک کے باریک سیپی کی طرح نازک نتھنے کسی نامعلوم جذبے سے پھڑک اُٹھتے اور ہیرے کی کیل لرز لرز جاتی۔

یہ سوچ کر کتنی حیرت ہوتی ہے کہ ابھی دو گھنٹے پہلے جولی گیکاں زندہ تھی۔ وہ اور کنور یادور سنگھ دونوں پانٹوں پر کھڑے دیر تک باتیں کرتے رہے، دھیمے سروں میں اور کسی قدر غصے کے ساتھ مگر شدید سنجیدگی سے وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف

تھے۔ اور جُولی گیکاں کی چوٹی بار بار کسی بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح اُس کی پیٹھ اور کولھوں پر لہراتی تھی۔ جُولی کلب کی واحد یورپین عورت تھی جس کے بال کٹے ہوئے نہیں تھے اور سب سے لمبے تھے اور سنہرے تھے اور اتنے ملائم کہ ڈھلتی ہوئی روشنی سے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ جُولی کا رنگ بیحد صبیح تھا، ہونٹ بھرے ہوئے اور رسیلے اور جب وہ فرانسیسی زبان میں بات کرتی تھی تو اس کی زبان کی سلاست، اُس کی آنکھوں کی گویائی اور ہاتھوں کی مرصّع جنبشیں مل کر ایک ایسا تاثر پیدا کرتی تھیں جس سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔

اب سے دو گھنٹے قبل کسی کے دل میں یہ خیال آسکتا تھا کہ جُولی یوں مر جائے گی؟ چمکتے ہوئے خوشگوار دن میں نازک پھوار کی طرح برستی دھوپ میں وہ سیاہ و سبز مخملیں جینز اور گلابی بلاؤز میں کھڑی پانٹوں پر کنور یادر سنگھ سے بات کر رہی تھی۔ وہ لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے تھے اور کلب کے ایک ممبر نے جس سے کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا، گھڑی دیکھ کر بعد میں بتایا تھا کہ جُولی اور یادر دونوں پورے پینتیس منٹ تک پانٹوں پر کھڑے بات کرتے رہے تھے پھر جُولی غصّے میں اپنی چوٹی لہراتی ہوئی کنور یادر سنگھ کا بازو جھٹک کر ایک موٹر لانچ میں بیٹھ کر سمندر میں گھومنے کے لئے چلی گئی تھی اور کنور یادر سنگھ اُسے بلاتا ہی رہ گیا تھا۔

جُولی موٹر لانچ دور تک سمندر کے پانیوں میں لے گئی مگر کسی وقت بھی اولڈ پاٹ کلب کا کھلا لاؤنج اُس کی نگاہوں سے اُوجھل نہیں ہوا۔ کشتی بہت دور لے جا کر اُس نے دوربین سے دیکھا تو اُسے اولڈ پاٹ کلب میں سے بہت سے لوگ دُوربینیں لگائے اپنی طرف دیکھتے ہوئے نظر آئے مگر کنور یادر سنگھ اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ کنور یادر سنگھ کی پیٹھ اُس کی طرف تھی اور اُس کے سامنے راجکماری نرملا بیٹھی تھی اور اُسے دیکھتے ہی اُس کے دل کے اندر رُکے ہوئے سارے آنسو اُس کی آنکھوں میں اُبل آئے اور وہ ایک چھلانگ لگا کر بوٹ پر کھڑی ہو گئی اور دُور کلب کی طرف ہاتھ ہلا کر پانی میں کود گئی۔

اُسے پانی میں کودتے دیکھ کر بہت سے ممبر چونکے اور دُوربینیں چھوڑ کر اپنی کرسیوں سے

اُٹھ کھڑے ہوتے اور اِدھر اُدھر بے بسی سے دیکھنے کے بعد پھر دُوربین اُٹھا کر دور سمندر کے پانیوں میں دیکھنے لگے جہاں موٹر بوٹ ایک سفید کاغذ کی کشتی کی طرح ڈول رہی تھی۔ چونکا دینے والی کیفیت دم بدم بے تابی میں بڑھتی چلی گئی۔ سیکنڈ اور منٹ وقت کے پہیے سے اُترتے چلے گئے اور جُولی پانی سے باہر نہ نکلی۔ گھڑی کی آواز کبھی ایسی صاف اور ہولناک نہ تھی اور اب جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، وقت کی گھڑی کے ساتھ دل کی گھڑی کی وحشت ناک آواز بھی شامل ہوتی جا رہی تھی۔ چند عورتیں چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں اور اسٹوارڈ چرن سنگھ اُسی وقت دو ملازم لے کر، دوسری موٹر لانچ لے کر جُولی کو بچانے کے لئے بھاگا مگر بہت دیر ہو چکی تھی اور اب وہ لوگ جُولی کی لاش موٹر بوٹ میں رکھ کر لا رہے تھے۔

قومیت کے بہت سے اصول ہیں۔ کچھ اچھے ہیں، کچھ بُرے بھی ہیں۔ اُن میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ باہر کے لوگوں پر کبھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اصول یہ بھی ہے کہ باہر کی عورتیں کبھی باوفا نہیں ہوتیں پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم باہر سے آنے والی ہوائی مہک کیوں سونگھتے ہیں اور باہر سے آنے والی بدلیاں اپنے وطن میں کیوں برسنے دیتے ہیں؟ جولی بھی ایک ایسی ہی بدلی تھی۔ رس اور جوانی اور برس کر سیراب کر دینے کی تمنا سے بھری ہوئی۔ جو باہر سے چند رنگر میں اپنے شوہر کے ساتھ وارد ہوئی تھی۔ موسیو گیکاں ایک ضروری کام سے پیرس سے چند رنگر بھیجے گئے تھے۔ چھ ماہ کے عرصہ ہی میں اُنھوں اپنا کام جس خوش اسلوبی سے سرانجام دیا، اُس سے متاثر ہو کر پیرس نے اُن کی خدمات مستقل طور پر ہندوستان ہی میں منتقل کر دیں۔ دو سال چند رنگر میں رہنے کے بعد وہ بمبئی بھیج دیئے گئے جہاں چار سال کے بعد ان کا انتقال ہو اس کے بعد چند سال جولی کے لئے اور نہ صرف جُولی کے لئے بلکہ اُس کے چاہنے والوں کے لئے بھی بڑے پُراسرار سال ہیں۔ جولی یکایک بمبئی سے لاپتہ ہو گئی۔ وہ اپنے وطن فرانس نہیں گئی مگر بورن کلب یا اولڈ پاٹ کلب یا اسی طرح کسی عمدہ کلب میں بھی دیکھی نہیں دیکھی گئی۔ اِدھر اُدھر کی افواہیں سُننے میں آجاتیں کہ وہ یہیں کہیں ہے مگر کہاں ہے یہ کسی کو پتہ نہ چلتا تھا۔ پھر کسی نے بتایا کہ جُولی نے کسی اینگلو انڈین سے شادی کر لی ہے جو ریلوے

میں انجن ڈرائیور ہے اور جو اُسے شراب پی کر پیٹتا ہے مگر کسی کو اس قسم کی افواہوں پر اعتبار نہ آیا۔ پھر سُنا گیا کہ وہ اینگلو انڈین ڈرائیور دراصل اینگلو انڈین نہیں تھا۔ آدھا ہندوستانی آدھا فرانسیسی یہودی تھا اور ملازمت ختم ہوتے ہی جولی کو چھوڑ کر برازیل چلا گیا پھر اس کا کیا ہوا جولی کا کیا ہوا؟ اب ان باتوں پر مزید غور کرنے کی ضرورت کیسے ہے؟ بوربن کلب میں لوگوں کی آس اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک آدمی سطح آب سے اُوپر سر نکالے تیرتا ہے بلکہ اگر ہونکے تو موٹر لانچ میں گھومتا ہے۔ جو لوگ غریبی کی سطح کے نیچے ڈوب جاتے ہیں وہ بھی تو مچھلیوں کی طرح فراٹی کرنے کے کام آتے ہیں۔

اس لئے کلبوں میں لوگ بھُول گئے، گھروں میں بھول گئے، پکنکوں میں بھول گئے اور ڈانس پارٹیوں میں بھول گئے کہ جولی گیکاں ایسی من موہنی مورت بھی بمبئی میں کبھی موجود تھی۔ نئی نئی موریں، نت نئے عشوے اور ادائیں لے کر دلوں کو برمانے لگیں۔

پھر یکایک ایک روز جولی گیکاں کلب میں وارد ہوئی۔ اکیلی تنہا، کسی ساتھی کے بغیر مگر بے حد خطرناک جولی۔ سنبھلی ہوئی، گہری، نازک اندام، خوش جمال مگر بے حد سنجیدہ اور خطرناک ہر نگاہ طرح دیتی ہوئی، ہر جنبش کرتی ہوئی، ہر نگاہ سازش کرتی ہوئی۔ اب وہ کھُلے دل کی فرانسیسی عورت نہیں تھی، ایک خطرناک ہندوستانی عورت بن گئی تھی۔

اتنے سال وہ کہاں رہی؟ اُس نے بتایا کہ وہ الموڑے کے آگے چلی گئی تھی اور سادھوؤں کے ایک مٹھ میں شامل ہو گئی تھی۔ وہ یوگا سیکھنا چاہتی تھی اور وہ پرانا فلسفہ جس سے تڑپتی ہوئی روحوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

اس سے پہلے جولی پیرس کے نائٹ کلب سے لے کر پیرس کے نئے فیشن تک بات کر سکتی تھی۔ اب وہ یوگ، فلسفہ، نروان سیکھ کر اور بھی خطرناک ہو گئی تھی۔ اب مردوں کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ اپنی عورتوں کی موجودگی کے باوجود جولی سے دُور رہ سکیں مگر جولی اب وہ پہلی سی جولی نہیں تھی۔ بدلی برس کر تھم گئی تھی۔ اب وہ اِدھر اُدھر

ذرا میں اُڑنا چاہتی تھی۔ اس کی نگاہیں کلب کے کہستانی سلسلے میں برف کی ایک چوٹی کی تلاش میں تھیں۔ صرف ایک آغوش، ایک سہارا، ایک ساتھی جسے وہ اپنا سب کچھ دیدے اور اُس سے سب کچھ لے لے۔ اب وہ پہلے کی طرح ہر کسی پر بھروسا کرنے والی عورت نہیں تھی جسے نہ ماضی کی فکر ہو، نہ مستقبل کی۔ اب اُس کی ساری جبلتیں مکمل بیدار تھیں۔ اب وہ کبھی غلطی نہیں کرے گی۔

نئے دور میں جتنے لوگ اُس کے قدموں میں گرے تھے، اُن میں سے اُس نے کنور یادور سنگھ کو چُن لیا تھا۔ ریاست بچل گڑھ کی امیر اور پرانی خاندانی ریاست کا واحد چشم و چراغ، خوب صورت اور دل کش، وجیہہ اور باوقار، شکار کا شوقین اور خوبصورت عورت کی ادائیں سمجھنے والا خوش لباس اور خوش اطوار۔ نہ اس قدر فیاض کہ صدیوں کی دولت دو دن میں لٹا دے، نہ اتنا کنجوس کہ جوہری کی صورت دیکھ کر ہی غش کھا جائے۔

کنور یادور سنگھ کو بھی جولی بے حد پسند آئی تھی۔ خوب صورتی کے علاوہ کنور یادور سنگھ یورپ کے حکمراں طبقے میں شادی کرنا بے حد پسند کرتا تھا۔ جولی خوب صورت تھی، ایک فرانسیسی افسر کی بیوی تھی، یورپ کی بہترین ڈپلومیٹک سوسائٹی دیکھے ہوئے تھی۔ خود جولی کا اپنا خاندان کنور یادور سنگھ کے خاندان کی طرح چھ سو برس پُرانا تھا۔ جُولی فرانس کی پہاڑیوں کی طرح پُرانی تھی، اُس کی انگوری وادیوں کی طرح شاداب اور حسین۔ کنور یادور سنگھ نے جُولی پر مر مٹنے کا اعلان کر دیا اور راجکماری نرملا ـــ ے ہاتھ کھینچ لیا جس سے چند دنوں میں اُس کی منگنی ہونے والی تھی۔

جُولی اور یادور سنگھ کا شعلۂ عشق چند ہی ماہ میں جنگل کی آگ کی طرح بھڑک اُٹھا اور یہ آگ اتنی تیز اور روشن تھی کہ دور سے دیکھنے والے کو بھی نظر آسکتی تھی۔ جُولی اور یادور ہر جگہ اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔ جولی اور یادور نے اپنی منگنی کا اعلان کر دیا تھا۔ مہاراجہ بچل گڑھ نے خود اُن کی منگنی میں شرکت کی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا اور عمدہ طریقے سے چل رہا تھا اور اگلی بہار میں اُن دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ جُولی بے حد خوش تھی۔ چاروں طرف کھُلا روشن آسمان تھا، کہیں کالے اَبر کا سایہ نہ تھا۔

پھر ایک سایہ نمودار ہوا، چڑیا کی آنکھ کے برابر۔ اولڈ پاٹ کلب میں گھپلا بھائی ملتانی نمودار ہوا۔ اُس کے کان لاؤڈ اسپیکر کے ہارن کی طرح لمبے اور اُوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ لمبے چوڑے اور تھوک سے بھرے ہوتے تھے۔ اُس کی آنکھیں بے چین، د... ناک اور چالاک تھیں۔ ایسی آنکھیں جنھیں دیکھ کر خیال آتا ہے کسی لومڑ کا یا سانپ کا، کبھی جھیل کا خیال نہیں آتا۔ پانی میں ٹھنڈے گہرے نیلے کنول کے پھول کھلے ہوئے بچوں کے کی طرح کھلکھلاتی ہوئی اس دُنیا میں ایسی آنکھیں بہت جلد انسان کے چہرے پر مرجاتی ہیں اور اُن کے بجائے جو آنکھیں آتی ہیں، وہ گھپلا بھائی ملتانی کی آنکھوں کی طرح ہوتی ہیں جن دیکھ کر جنگل میں کسی گھرے ہوتے جانور کا خیال آتا ہے۔

گھپلا بھائی ملتانی ایک فلم پروڈیوسر تھا اور اپنے کروڑ پتی فنانسر بچو بھائی کے ہمراہ مہمان ہوکر پاٹ کلب میں وارد ہوا تھا۔ بچو بھائی نے ابھی اُس کی پکچر کے لئے فنانس نہیں کیا تھا اس لئے ابھی گھپلا بھائی ملتانی بچو بھائی کی تعریف میں قلابے ملانے پر مجبور بچو بھائی اُس کی مجبوری سمجھ کر ہی اُسے پاٹ کلب میں اپنے ساتھ لے آیا تھا تاکہ وقت بے وقت اپنی تعریف لوگوں کو سُناتا رہے۔ گھپلا بھائی ملتانی تعریف کرتا تھا اور بچو بھائی یوں سُنتا تھا جیسے وہ تعریف کو وہسکی کے گلاس میں ڈال کر ہونے ہولے چُسکی لے رہا ہو۔ عمدہ تعریف ہر لحاظ سے بالکل اسکاچ وہسکی کی طرح ملائم ہوتی ہے مگر گھپلا بھائی ملتانی بے حد چھچھورا بھی تھا۔ جس ملائمت سے وہ بچو بھائی کی تعریف کرتا تھا، اُسی شدت سے وہ اُن لوگوں کی مخالفت کرتا تھا جن سے اُسے کسی طرح کا فیض نہیں پہنچتا تھا۔ خاص طور اُس کی زبان عورتوں کے سلسلے میں بےحد کالی تھی۔ ایک چھچھورے آدمی کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ کبھی عورت کی عزت نہیں کرسکتا اور ملتانی زندگی کے جس شعبے سے آیا تھا وہاں سیکس بوچڑ خانے کے گوشت کی طرح بکتا تھا اس لئے ملتانی کبھی یہ سمجھ نہ سکا کہ ایک عورت اور دوسری عورت میں کیا فرق ہے۔ اُس کے لئے سب عورتیں گوشت کے ٹکڑے تھیں

"جولی گیکاں جولی گیکاں؟؟" ایک روز اُس نے بچو بھائی کی آدھی بوتل ختم کرنے بعد کہا۔ "میں جولی گیکاں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟" بچو بھائی نے اُس سے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "وہ تو مُنہ نہیں لگاتی۔"

"وہ نہ لگائے مگر اس کے مُنہ کا مزا تو مجھے معلوم ہے۔" کھپلا بھائی ملتانی ذرا بلند از میں بولا۔

"شُش۔" بچو بھائی اور دوسرے لوگ اس کی ٹیبل کے ارد گرد اِدھر اُدھر متحرک ہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "بے ہودہ باتیں مت کرو کھپلا بھائی ملتانی! وہ سُن لے گی۔"

"سُن لے۔ میں کوئی اُس سے ڈرتا ہوں۔" کھپلا بھائی ملتانی گرج کر بولا۔ "جولی ہاں؟...... جولی گیکاں مائی فوٹ۔ جولی گیکاں تو میری فلم میں ایک ایکسٹرا لڑکی کا کر چکی ہے۔ آج بڑی نواب زادی بن کر ایک راجا سے شادی رچانے چلی ہے مگر ہے تو م کی ایک ایکسٹرا لڑکی۔"

"تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟" بچو بھائی نے دلچسپی لیتے ہوئے ملتانی ے پوچھا۔

ملتانی نے اپنی ٹیبل کے چاروں طرف دیکھا، لوگ حیرت اور سکتے میں آگے لے ہوئے چاروں طرف سے اُسے دیکھ رہے تھے، اتنے بڑے کلب میں، اتنے امیر رشاندار کلب میں آج وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ اپنی سانس روکے ہوئے لوگ اُس یک ایک لفظ غور سے سُن رہے تھے۔ ایسا اہم لمحہ کھپلا بھائی ملتانی کی زندگی میں کبھی نہیں تھا۔ اُس نے اپنا کھپلا ختم کیا، مسکرا کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا؛ اپنا بٹوا نکالا، بٹوا نکال اُسے بڑی احتیاط سے کھولا، اُس میں سے دو تصویریں نکالیں اور حاضرین کی خدمت پیش کرتے ہوئے بولا۔ "یہ لیجئے حضور! میرا ثبوت حاضر ہے۔"

لوگ ہاتھوں ہاتھ تصویریں لیتے گئے، دیکھتے گئے، ایک دوسرے کو دیتے گئے واقعی جولی کی تصویریں تھیں۔ ایک فلمی ناچ کے لباس میں دوسری ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی کھڑی تھی۔ وہی جولی جواب کلب کے ایک کونے میں اپنے منگیتر کنور یادو سنگھ کے ساتھ بیٹھی ہوئی بڑے باوقار انداز میں مارٹینی پی رہی تھی۔ لوگ تصویریں دیکھنے اور حیرت سے گھپلا بھائی کو دینے لگتے۔ گھپلا بھائی ملتانی خوشی سے پھول کر کُپا ہو گیا۔ اپنے ہاتھ میں نیا جام لے کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "گھپلا بھائی ملتانی پیش کرتا ہے جولی گیکاں کی کہانی" وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بچو بھائی نے اُس کی پکچر کے لئے سر دیدیا ہے۔ پکچر سنسر ہو چکی ہے اور اب فل ہاؤس کے سامنے اُس کی نمائش ہونے والی ہے۔ لہٰذا اُس نے ایکبار پھر چیخ کر کہا۔

"گھپلا بھائی ملتانی"

" پیش کرتا ہے جولی گیکاں کی کہانی" اُس کے دونوں ہاتھ فخریہ لہجے میں اُوپر اُٹھے ہوتے تھے۔ اچانک ایک زور کا طمانچہ اُس کے گال پر پڑا اور وہ دم بخود ہو کر کرسی پر گر پڑا اور اُس کی چالاک سہمی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ اس کے سامنے جولی گیکاں کھڑی ہے جو اپنے کونے سے اُٹھ کر اُس کے سامنے چلی آئی تھی۔ اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ تھا اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی اور اُس نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ پستول دیکھتے ہی گھپلا بھائی نے دونوں آنکھیں بند کر لیں اور فوراً بے ہوش ہو کر کرسی کے نیچے گر پڑا۔

اُسی وقت کنور یادو سنگھ نے آ کر جولی کے ہاتھوں سے پستول چھین لیا مگر جولی اپنا ہاتھ چھڑا کر وہاں سے بھاگ گئی۔

دوسرے دن کنور یادو سنگھ راجکماری نرملا کو لے کر سیلنگ پر چلا گیا۔ اُس کی غیر حاضری میں جولی کلب میں آئی، لوگوں نے اُسے دیکھا مگر کسی نے اُس سے بات کر۔

کی کوشش نہیں کی۔ ہاں جب کنور یادور سنگھ سیلنگ کر کے واپس آیا تو وہ اُسے پانوٹس کے برج پر مل گئی۔ راجکماری نرملا تو کترا کر جولی کے قریب سے گزر گئی مگر کنور یادور سنگھ کا راستہ جُولی نے روک لیا۔ "ہیلو!"

"ہیلو!"

"کیا یہ سچ ہے؟" کنور نے پوچھا۔

"سب سچ ہے۔" جُولی نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" کنور نے کسی قدر غصّے سے پوچھا۔

"کیونکہ تمہارے سماج میں عورت کو غلطی کرنے کا حق نہیں ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" کنور یادور سنگھ نے سر جھکا کر کہہ دیا۔

"تم بتاؤ، اگر میں تمہیں بتا دیتی تو کیا تم مجھ سے محبّت کرتے؟"

"محبّت تو کرتا مگر دور رہ کر۔"

"اور اب؟"

"اب میں منگنی توڑنے پر مجبور ہوں۔"

"کیوں؟"

"مہاراج کہتے ہیں، جس کی فلم لوگ چار چار آنے میں دیکھ سکتے ہیں وہ میرے محل میں کیسے آئے گی۔ وہ میری بہو کیسے کہلائے گی؟ اور اُس سے میرا پوتا پیدا ہوگا؟"

"جو عورت بھی جنم دے سکتی ہے وہ ماں ہے وہ کسی محل میں بھی راج کر سکتی ہے۔" جولی نے شعلہ رُو ہوتے ہوئے کہا۔ "رہا راجاؤں کا سوال تو ڈارلنگ! تمہیں تو یاد ہوگا، ہمارے ملک نے اپنے بادشاہوں کو پھانسی بھی دی، اُنھیں معزول کیا، اُن سے ہوٹل میں بیرا گیری بھی کروائی اور موچی کا کام بھی لیا۔"

"تم میرے باپ کی بے عزّتی کر رہی ہو؟" کنور نے زور سے بھڑک کر کہا۔

"نہیں۔ میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں"۔ جولی نے رُک رُک کر اپنے آنسو روک کر سسکتے ہوئے کہا۔ "میں نے صرف اس لئے اپنی چند برس کی غربت تم سے چھپائی تھی کہ کہیں تم مجھ سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤ حالانکہ اس میں نفرت ——— کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ غریبی تو انسان کا پہلا حق ہے"۔

"مگر دوسروں کے لئے"۔ کنور نے اس پوری بحث سے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اور میرے درمیان اب سارے رشتے ختم ہیں"۔ کنور نے فیصلہ کن لہجے میں کہہ دیا۔

"سینٹ ایملائن کے قصبے میں ہمارا ایک خوبصورت گھر ہے جس کے پتھر کے زینے دریائے رائین تک جاتے ہیں۔ آج میرے باغ کی بیلوں میں انگور کے گچھے مہک رہے ہوں گے۔ میری وادی میں چلو میرے یار!"

"گڈ بائی جُولی!"

"گڈ بائی!"

اور اب وہ لوگ اس کی لاش لا رہے تھے۔ جو لوگ اس منظر کی تاب نہ لا سکے۔ اُنھوں نے نگاہیں پھیر لیں۔ کچھ لوگ سر جھکائے مؤدب کھڑے ہو گئے اور جُولی کی لاش کو راستہ دینے لگے جسے چرن سنگھ اسٹیوارڈ نے اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھا رکھا تھا۔ جولی کا گلابی بلاؤز اُس کے جسم سے چپک گیا اور سیاہ سبز مخملی جمپر پانی میں بھیگ کر بھی بے حد ٹائٹ ہو گیا تھا اور اُس کے سر کے بال بالکل کھلے ہوئے تھے اور نرس کے غالیچے تک آ رہے تھے اور اُن میں سے پانی بہہ رہا تھا اور غالیچہ بھگوتا جا رہا تھا۔ معاً ہر شخص نے گھبرا بھائی ملتا کو کئی گز کے فاصلے سے اکیلا چھوڑ دیا۔ کوئی شخص اُس کے قریب جانے کو تیار نہیں تھا۔ جیسے وہ انسان نہ ہو، کوئی خارش زدہ کتا ہو۔ اُس وقت سب کی آنکھیں یا درسنگھ اور راجکماری نرملا پر لگی ہوئی تھیں جو اندر لاؤنج کے ایک کونے میں سب کی نظروں سے چھپ کر بیٹھ گئے تھے مگر لاش لیڈیز کلوک روم میں لے جانے کے لئے اسٹیوارڈ کو اندر کے

لاؤنج سے گزرنا پڑا اس لئے وہ نہایت خاموشی سے جولی کی لاش اُٹھائے ہوئے اندر سے گزرتا گیا اور جہاں بیٹھا تھا، وہیں پتھر کے بُت کی طرح خاموش بیٹھا رہ گیا۔ کنور یادو سنگھ نے آنکھوں کے گوشوں سے چرن سنگھ کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا، ایک لمحے کے لئے اُسے جُولی کے سفید سُتے ہوئے چہرے پر گہری سبز آنکھیں کھُلی ہوئی دکھائی دیں، دوسرے لمحے میں بالوں کا گھنا جال اُس کے قدموں پر آنسوؤں کی لکیر بناتا ہوا گزر گیا۔ یکایک اُس کے دل میں ایک بھونرسا پھرنے لگا مگر وہ جانتا تھا کہ اس وقت سارے کلب کی نگاہیں اُس پر ہیں اس لئے اُس نے اپنے آپ کو سنبھال کر ہر قسم کے جذبے سے عاری لہجے میں راجکماری نرملا سے پوچھا: "آپ کیا پئیں گی۔ پورٹ یا شیری؟"

اس سوال پر پروفیسر ملکانی سوچنے لگا کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ بے رحم ہے؟ گھیلا بھائی ملتانی یا کنور یادو سنگھ؟ جب وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو اُس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "ہم لوگ ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہیں۔" اُس کے ساتھی نے کوئی جواب نہیں دیا اُس نے بھی اپنا سماجی فلسفہ تہہ کر دیا اور موت کے سامنے ایک معمولی بشر کی طرح سر جُھکا دیا۔

جب اسٹیوارڈ جولی کی لاش لئے ہوئے لیڈیز کلوک روم میں داخل ہوا تو ایک ایک کر کے سب لیڈیز بھاگ گئیں۔ کلوک روم میں اکیلی کاشی بائی رہ رہی تھی کیونکہ کلب میں اکیلی وہی عورت تھی جو محبت کا درد سمجھتی تھی۔ اسٹیوارڈ نے جُولی گیکاں کی لاش دیوان پر لٹا دی پھر ایک لمبی سانس لے کر کاشی بائی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "یہ جولی میم صاحب کو کیا ہوا؟"

کاشی بائی نے چند لمحے اسٹیوارڈ کو گھور کر دیکھا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ اسٹیوارڈ نا سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تو اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا اور دھیرے سے آہ بھر کر کہا۔ "کچھ نہیں اسٹیوارڈ! جولی میم صاحب بہت دور سیلنگ کو نکل گئی ہیں۔"

بیوی کترا

اولڈ بورو بورن کلب تو مالابار ہل پر بنی ہوئی ہے مگر اولڈ بیاٹ کلب سمندر کے کنارے کف پریڈ پر قائم ہے۔ دونوں کلبوں میں ایک عجیب قسم کی مشابہت ہے جس میں اولڈ بیاٹ کلب کی حیثیت جونیئر پارٹنر کی ہے وہ اس طرح کہ اولڈ بورو بورن کلب کے تمام ممبر اولڈ بیاٹ کلب کے ممبر سمجھے جاتے ہیں اگرچہ اولڈ بیاٹ کلب کا ہر ایک ممبر اولڈ بورو بورن کلب کا ممبر نہیں بن سکتا۔ اولڈ بیاٹ کلب کی شرائط زیادہ آسان اور لچک دار ہیں۔ وہاں محض روپیہ دیکھا جاتا ہے۔ خاندانی شرافت اور اس قسم کے دیگر جھمیلوں میں نہیں پڑتے وہ لوگ۔

کنور بلدیو سنگھ دونوں کلبوں کے ممبر ہیں مگر اپنا بیشتر وقت اولڈ بیاٹ کلب میں گزارتے ہیں کیونکہ اُنھیں بادبانی کشتیوں کی ریس کا بہت شوق ہے جسے یہ لوگ یاٹنگ یا سیلنگ کہتے ہیں۔ کنور بلدیو سنگھ جب سے رنڈوے ہوتے ہیں، اُن کے شوق بہت حد تک محدود ہو چکے ہیں۔ اب اُن کی دلچسپیاں محض عورت، شراب اور بادبانی کشتیوں پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس سے پہلے انھیں کرکٹ، شکار اور اسنوکر کا بھی چسکا تھا لیکن جب سے اُن کی بیوی کا انتقال ہوا ہے، انھوں نے اُس جنت مکانی کے سوگ میں کرکٹ، شکار اور اسنوکر جیسے شغل ترک کر دیئے ہیں اور اب محض عورت، شراب اور بادبانی کشتیوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اُن کی بادبانی کشتی کا نام بھی ان کی مرحوم بیوی کنور رانی پرملا سنگھ کے نام پر پرملا رکھا گیا ہے۔ وہ پرانی وضع قطع کے ہیں اور انگریزوں سے نفرت کرنے کی وجہ سے صرف وہ شراب چکھتے ہیں جس کا نام بلیک ڈاگ ہے۔ کنور صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے کلب کی پچیس برس کی ممبری کے دوران میں آج تک کسی کنواری لڑکی پر نظر نہیں ڈالی۔ دوسروں کی بیویاں خود کنور صاحب پر فریفتہ ہو جائیں اور پیچھے پیچھے پھرنے لگیں تو اس میں وہ بیچارے کیا کر سکتے ہیں؟ ایسے با اخلاق

فرشتہ سیرت، قدیم روایات پر جان چھڑکنے والے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں؟۔

لیکن جیسا ہر کامیاب آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ لوگ اُن کے بارے میں بھی متعجب ہیں اور ایسے لوگ انھیں رشک کے مارے بوی کنزا کے نام سے یاد کرتے ہیں حالانکہ یہ ان کا پیشہ نہیں ہے، محض شغل ہے۔ جیسے وہ کبھی کبھی اپنے مصاحبوں کا دل بہلانے کے لئے ایسا کیا کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ تب شروع ہوتا ہے جب کلب میں کوئی نئی چاند سی عورت دکھائی دے اور یار لوگ اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے اپنی سی کر کے رہ جائیں۔ اُس وقت تک کنور بلدیو سنگھ کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتے۔ کبھی کسی عشق میں پہل نہیں کرتے بلکہ انتہائی وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے دوستوں کو اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ وہ جی بھر کر خدمت کریں اور روپے کی آزمائش کریں۔ انہیں اعتماد ہے کہ معاملہ سنگین ہوا اور یار دوستوں نے مُنہ کی کھائی تو ہار مان کر انھیں کنور بلدیو سنگھ کے سپرد یہ معاملہ کرنا پڑے گا جسے وہ کچھ دنوں میں بلکہ صرف ایک ہی دن میں بڑے آرام سے سلجھا لیں گے۔

یہ سوچنا عبث ہوگا کہ کلب میں صرف مشتبہ چال چلن کی عورتیں آتی ہیں۔ کلب میں کئی قسم کی عورتیں آتی ہیں۔ ایسی عورتیں جو حقیقت میں کنواری ہوتی ہیں اور جن کے اِدھر اُدھر ہمیشہ اُن کے خاندان کی کوئی نہ کوئی شریف عورت حفاظت کے لئے تیار رہتی ہے۔ انھیں بیکار پھل کی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے پھر کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو عمر کنواری ہوتی ہیں اور تیس چالیس برس کی عمر تک کامیاب دنا کامیاب معاشقوں کے بعد کنواری ہی کہلاتی ہیں، اکثر کلبوں کی رونق انہی عورتوں کے دم قدم سے ہوتی ہے مگر بہت سی ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو اصل میں شریف شادی شدہ اور شوہر پرست ہوتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو بہن جی، بھابی جی، موسی جی کہہ کر قبول کر لیا جاتا ہے۔ پھر کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو نئے چہرے کہلاتی ہیں۔ کلب کے اکثر و بیشتر ممبروں کا دھیان ان کی طرف مائل رہتا ہے۔ در حقیقت گفتگو کا موضوع

وہی ہوتی ہیں۔

کلب میں گزشتہ پندرہ دن سے ایک نئے چہرے کے تذکرے تھے۔ مسز بیلا رائے چودھری اپنے شوہر شری پرمل رائے چودھری کے ساتھ لندن جانے والی تھی، جہاز میں بکنگ ہو چکی تھی، اس وقت کمپنی کے ہیڈ کوارٹر سے مسٹر چودھری کو پندرہ دن کے لئے بلوا لیا گیا۔ پرمل اپنی حسین بیوی کو کلیگ ہوٹل میں چھوڑ کر دلّی چلا گیا۔ اسکیم یہ تھی کہ پندرہ دن کے لئے دلّی واپس جانا مسز چودھری کے لئے فضول ہوگا جبکہ پندرہ دن کے بعد ہی اُن دونوں کو پھر بمبئی سے لندن کے لئے روانہ ہونا پڑے گا۔ غرض کہ پرمل بیلا کو کلیگ ہوٹل میں اپنے دوست اور لکھ پتی بیوپاری کھیم جی کلیان جی کی نگرانی میں چھوڑ کر بمبئی سے دلّی چلا گیا۔

کھیم جی کلیان جی اسکریپ آئرن یعنی ٹوٹے پھوٹے لوہے کا بیوپار کرتے تھے۔ اُن کے کاٹن گرین کے علاقے میں جوٹ کے کئی گودام تھے۔ اس کے علاوہ ان کا دل اور چہرہ بھی زنگ خوردہ لوہے کی طرح سخت اور خشک تھا۔ پھر انھیں بیس برس سے دمے، ذیابیطس اور گٹھیا کے روگ تھے، ان تین بیماریوں نے اتنا ستایا کہ ان کی موجودگی میں کوئی اور بیماری پالنا مشکل ہے۔ چونکہ کلب کے کچھ ممبروں کے خیال کے مطابق عورت بھی ایک بیماری ہے جو صرف مرد کو ہوتی ہے۔ اس لئے کھیم جی کلیان جی نے کچھ اپنے غیروں کے لئے کچھ اپنے دوست چودھری کو خوش کرنے کے لئے اور کچھ کلب کے ممبروں کی بھلائی کے لئے مسز بیلا رائے چودھری کو کلب میں آزاد چھوڑ دیا۔ جہاں مسز چودھری اپنی پُرکشش شخصیت کی وجہ سے بہت جلد کلب کے رنگین مزاج ممبروں کی نگاہوں کا مرکز بن گئیں۔

بیلا ایک لمبے قد، لمبے بال والی دلکش مسکراہٹ والی، جگالی حسینہ تھی۔ بنگالے کا جادو یوں بھی مشہور ہے۔ بیلا کی آواز اتنی میٹھی تھی کہ اس کے گلے پر شہد کے چھتے کا گمان ہوتا تھا جب وہ چلتی تو دیکھنے والوں کے دل لوٹتے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی عورت نہیں چل رہی ہے بلکہ ہنس اپنی لمبی گردن اٹھائے تیور چڑھائے کسی جھیل کی سطح پر تیر رہی ہے۔ جب وہ اپنا نچلا ہونٹ ذرا سا دبا کر مسکراتی تھی تو دیکھنے والوں کے دل میں

گلاب کے پھول کھل جاتے تھے اور بنگالی کجرا لگی آنکھوں کا قیامت خیز جادو تو مشہور ہی ہے۔

بیلا رائے کو کلب کا ماحول بہت پسند آیا۔ بیشتر مردوں کی توجہ پر وہ بُرا ماننے کے بجائے دل ہی دل میں کھِل اُٹھتی۔ اس کا ایک سبب تھا۔ پرمل رائے چودھری ایک صابن ساز کمپنی میں سیلز مینیجر تھا۔ اس بیچارے کو اپنے کام کے سلسلے میں آئے دن دورے پر رہنا پڑتا تھا اس کی عدم موجودگی میں بیلا اپنی تنہائی اور خاموشی بڑی شدت سے محسوس کرنے لگتی تھی۔ پھر جب کبھی وہ اپنے دورے سے واپس آتا تو زیادہ تر صابن ہی کے بارے میں باتیں کرتا چونکہ اُس کا پیشہ ہی صابن فروخت کرنا تھا۔ اُس کا اگر اختیار ہوتا تو ن بھر صرف صابن کے بارے میں باتیں کرتا بلکہ لوگوں کو صابن کھلا بھی دیتا اور بیلا ایک خوش مزاج، پڑھی لکھی، شعر و نغمہ، رقص و سرود پسند کرنے والی عورت تھی اور پرمل کو کلب لائف سے نفرت تھی۔ وہ اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا تھا اور ہر پیار کرنے والے شوہر کے مانند اپنی بیوی کے حُسن سے حسد کرتا تھا اور جہاں تک ہو سکتا تھا اپنی بیوی کو دوسروں کی نظرِ بد سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا اس لئے بیلا اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں تھی مگر چونکہ وہ ایک سمجھ دار اور سیدھی سادی عورت تھی اس لئے دلی جذبات دبا کر جس طرح بھی ہو سکا، اب تک اپنی روکھی پھیکی زندگی پر قناعت کرتی رہی۔ اُس کا دل ایک شوخ چنچل تتلی کی طرح بہت چاہتا تھا کہ کاش! اس کا شوہر بھی چھبیلا، بانکا، خوش حال زندگی گزارنے والا ہوتا مگر وہ تو رات دن صابن کے سوا کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ صابن کی تعریف سن کر بیلا کے دل میں دُنیا بھر کے تمام صابنوں سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ لندن جانے کی بھی اسے کوئی خوشی نہیں تھی کیونکہ اُسے کامل یقین تھا کہ لندن میں بھی اُس کا شوہر دن رات صابن کی فیکٹری میں گھسا رہے گا۔ جہاں وہ ٹریننگ کے لئے کمپنی کی طرف سے جا رہا ہے۔ اور وہ دن بھر ایک ٹھنڈے برفیلے فلیٹ میں ایک اجنبی ماحول میں سڑا کرے گی۔

لیکن اس کلب کا ماحول کتنا تابناک اور گھلا ملا تھا۔ مردوں کے تعریف آمیز جملے کتنے خوبصورت تھے۔ ان جملوں سے جیسے گلاب اور جوہی کی مہک آتی تھی۔ مارٹن کی پہلی کاک ٹیل میں ایسی نازگی تھی جیسے برسات کی پہلی پھوار میں ہوتی ہے۔ والز کے پہلے رقص میں کتنی نرماہٹ تھی جیسے وہ ہواؤں میں اُڑنے والی کوئی تتلی ہے۔ ایسی ہی زندگی تو وہ چاہتی تھی اور جانے کیوں کر وہ اب تک تنہائی میں قید کاٹتی چلی آئی تھی اپنے لذت بخش شباب کے لوٹتے ہوئے دن یاد کر کے اُس کے دل میں اپنے شوہر کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھرنے لگے تھے۔

بایں ہمہ آج تک اُس نے کوئی ٹھوکر نہیں کھائی تھی۔ اس لئے انتہائی قدم اُٹھانے سے پہلے ہمیشہ گھبرا جاتی کسی ——————— مرد کے کھُلے پن سے ڈر کر کترا جاتی اور وہاں سے اُٹھ جاتی۔ رقص کرنے کے بعد جب کسی کے ساتھ اکیلے ڈائیو پر جانے کا سوال پیدا ہوتا تو جھجک کر، پریشان ہو کر رضامند ہوتی۔ وہ آگ تاپنا چاہتی تھی مگر آگ کی تپش سے ڈرتی تھی۔ اس لئے چار پانچ دن کی جستجو کے بعد بہت سے طلب گاروں نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ کلب کے امیر ممبر اپنے بزنس کی طرح عشق میں فوراً منافع کی اُمید کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا وقت بھی کہاں ہوتا ہے کہ تمام زندگی ایک عورت کے عشق میں ضائع کر دیں۔ اس لئے یاروں نے کھیم جی کا یہ معاملہ کنور بلدیو سنگھ کے سپرد کر دیا اور پھر دور ہی دور سے کہنہ مشق کھلاڑیوں کی طرح کھیل دیکھنے لگے۔

دوسرے دن یاروں نے دیکھا کہ مشرقی لاؤنج کے ایک کونے میں بیلا اور کنور جی بیٹھے ہوئے ہیں اور بیلا انہیں "گیتا نجلی" پڑھ کر سنا رہی ہے، اشعار کا مطلب سمجھا رہی ہے۔ کنور بلدیو سنگھ آج صبح کہیں سے "گیتا نجلی" کی ایک جلد اُٹھا لائے تھے۔ انہوں نے اپنے عشق کا آغاز بہت مناسب طریقے سے کیا تھا یعنی رابندر ناتھ ٹیگور سے۔ ایک بنگالی

کا دل قابو میں کرنے کے لئے پہلا قدم یہی ہے۔

"گورودیو! اگورودیو!" کنور صاحب نے مترنم لہجے میں کہا۔ "گورودیو کی کویتا پر تو میری جان جاتی ہے بیلا جی! اُن کی کویتا کیسی نرم اور رسیلی ہے۔ جیسے میری بادبانی کشتی سمندر کی سطح پر تیرتی ہے ایسے ہی گورودیو اپنی کویتا کی کشتی میں بیٹھ کر عقیدت مندوں کے سروں پر مچلتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، گورودیو دُنیا کے عظیم ترین شاعر ہیں۔"

بیلا کو انتہائی مسرور ہوئی۔ مگر ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "جی نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔"

کنور بلدیو سنگھ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "گورودیو کا جواب نہیں ہے۔ اس دُنیا میں۔ افسوس یہ ہے کہ میں نے گورودیو کو صرف انگریزی میں پڑھا ہے، سُنا ہے، بنگلہ میں ان کویتاؤں کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

بیلا بے حد خوش ہو کر بولی۔ "سنیئے یہ کویتا میں بنگلہ میں سناتی ہوں۔"

"جی نہیں ایسے کام نہیں چلے گا۔ گا کر سُنایئے۔"

پہلے تو بیلا نے نامنظور کر دیا۔ مگر کچھ اصرار کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ لاؤنج کے کونے میں بیٹھی ہوئی بیلا گا رہی ہے اور کنور بلدیو سنگھ آنکھیں بند کر کے جھوم رہے ہیں، جب گیت ختم ہو گیا تو کافی دیر بعد کنور بلدیو سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور سرد آہ بھر کر بولے۔ "گورودیو کی کویتا اور آپ کی آواز ایسا معلوم ہوا جیسے میں شانتی نکیتن پہنچ گیا ہوں۔ جیسے ردی ٹھاکر کے چرنوں میں ہوں۔ وہ خاموش گمبھیر چہرہ۔ وہ کھلتا آسمان۔ وہ ناریل کے حسین جھنڈ اور یہ زبان۔ صاحب! میری تو دوسروں سے لڑائی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی زبان کی تعریف کرتے ہیں مگر نہیں صاحب! بنگلا کے میٹھے بولوں کو کون پہنچ سکتا ہے۔؟ جس پر آپ کی آواز شہد گھول دیتی ہے۔" بیلا کا چہرہ خوشی سے کانوں تک سُرخ ہو گیا وہ کچھ بول ہی نہ سکی کیونکہ بلدیو سنگھ نے گہرے یقین اور اپنے نئے انداز میں بیلا کا ہاتھ

پکڑ لیا اور بولے ۔"کیا آپ مجھے بنگالی سکھا دیں گی ؟"

"میں تو اب یہاں کتنے دن ہوں، آٹھ دن سے زیادہ تو نہیں رہوں گی۔"

"بہت وقت ہے، آدمی کے دل میں اگر سیکھنے کی تمنا ہو اور آپ جیسی خاتون سکھانے کو مل جائے تو سیکھنے میں کہاں دیر لگتی ہے۔ میری مرحومہ بیوی پرمیلا کو بنگالی زبان سے عشق تھا۔"

"آپ کی ...... آپ کی بیوی مر چکی ہیں ؟" بیلا نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آٹھ برس ہو گئے۔"

"اور آٹھ برس تک، میرا مطلب ہے، اب تک آپ نے شادی نہیں کی ؟"

"کوئی اپنے مطلب کی عورت ہی نہیں ملی"، کنور جی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا اور پھر اپنی آنکھیں نیچے جھکا لیں۔

نہ جانے کیوں بیلا کی آنکھیں ایکدم بھر آئیں۔ کنور جی کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ پر تھا لیکن اپنا ہاتھ ہٹانے کو بیلا کا جی نہ چاہا۔ "بیچارہ!" بیلا نے اپنے دل میں کہا۔ اُوپر سے کتنا ہلنڈرا لگتا تھا۔ ہر وقت بیلنگ کرتا ہوا یا شراب پیتا ہوا مگر اندر سے یہ کتنا معصوم اور مظلوم ہے۔

اس کے بعد کے دو دن یاروں نے دیکھا کنور بلدیو سنگھ بہت سعادتمند شاگرد بنے ہوئے بیلا سے بنگلا زبان سیکھ رہے ہیں۔ دونوں صبح ہی صبح گھر سے کلب آجاتے ہیں۔ ایک ہوٹل سے، دوسرا اپنے گھر سے اور شام کو ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ بلدیو سنگھ نے کبھی بیلا کو اکیلے سیر پر جانے یا ڈائیو پر جانے کی دعوت نہیں دی کبھی گستاخانہ اندازا نہیں کیا۔ ایک رقص کے بعد کبھی دوسرے رقص کی فرمائش نہیں کی۔ وہ بہت ڈھنگ سے چل رہے تھے۔

"بہت سلو جا رہا ہے میرا یار،" پرنس فیروز نے جو خود اس فن کے اُستاد سمجھے

جاتے تھے، اسپی نام کے ایک لکھ پتی نوجوان سے کہا۔

"کنور کی اپنی ٹیکنیک ہے پرنس!" اسپی اپنی سنہری پٹی کستے ہوئے بولا۔ "اور نشانہ کبھی نہیں چوکتا اور ابھی تو اس نے اپنا ہنٹنگ کوٹ نہیں نکالا ہے۔"

کلب میں کنور بلدیو سنگھ کا شکاری کوٹ بہت مشہور تھا۔ یہ آدھا اسکاٹ لینڈ کی اُون کا۔ آدھا چمڑے کا بنا ہوا تھا۔ اس کی بیرونی دونوں جیبیں باہر لٹکی رہتی تھیں اور کہنیوں اور آستینوں پر بھورا چمڑا لگا ہوا تھا۔ یہ کوٹ صرف دو مرتبہ نکالا جاتا تھا۔ ایک بادبانی کشتیوں کی بڑی ریس کے موقع پر، دوسرے اس موقع پر جب کنور جی کسی عورت پر اپنا آخری وار آزمانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ یہ ہنٹنگ کوٹ گویا ایک قسم کا سگنل تھا۔ جھنڈا تھا لڑائی کے اختتامی دور کا۔ جس دن یہ ہنٹنگ کوٹ پہن کر کنور بلدیو سنگھ کلب میں آتے، اس دن یار لوگ سمجھ جاتے کہ آج دشمن کی خیر نہیں، خواہ وہ عورت ہو یا ریس میں ان کا کوئی مدِمقابل ہو چنانچہ پرنس فیروز اور اسپی کی اس گفتگو کے دوسرے ہی دن کنور صاحب اپنا ہنٹنگ کوٹ پہن کر کلب میں داخل ہوئے تو دبی دبی زبان میں چاروں طرف کانا پھوسی ہونے لگی

"آج اعلانِ جنگ ہے۔"

"فائنل ہے میچ کا۔"

"بے چاری"

رضیہ علاالدین نے جو اس کلب میں نئی نئی آئی تھی اور جس نے لکھنؤ میں اپنے حسن و شباب کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے، تن کر اپنی سہیلی مسز رضا سے پوچھا۔ "یہ کون آدمی ہے؟ اس نے کیوں جنگلیوں کا سا لباس پہن رکھا ہے؟"

"یہ کنور بلدیو سنگھ ہے، بڑا چھبیلا سمجھا جاتا ہے۔"

"ہٹو"۔ رضیہ علاالدین خفا ہو کر بولی۔ "بالکل بن مانس معلوم ہوتا ہے۔"

ٹیکا پرمل کمار نے اپنے عزیز دوست گردھاری لال سے کان میں کہا۔

دھاری لال! اس کمبخت کے ہنٹنگ کوٹ میں کیا رکھا ہے؟ جس دن کنور بلدیو سنگھ
ٹ پہنتا ہے، عورتوں کی تمام مخالفت ختم کر دیتا ہے۔"

یہ تمام باتیں یاٹ کلب کے بارے میں ہو رہی تھیں۔ جس کی سیڑھیاں کف پر بڑے
رنگ جاتی تھیں جہاں پنٹو برج سے لگے ہوئے کلب کے یاٹ کھڑے تھے۔ آج
کرنے کے لئے کنور بلدیو سنگھ یہ کوٹ پہن کر آیا تھا اور اُس نے پہلی مرتبہ بیلا کو
در میں سیلنگ کی دعوت دی تھی اور اسے اپنا "کو" بنا لیا تھا۔ ساڑھے چار میل کی ریس
اُس کی کشتی کے علاوہ چھ اور کشتیاں حصہ لے رہی تھیں۔" بیلا کا اسکپر" کنور بلدیو
تھا۔ وہ ریس کرنے میں کامل مانا جاتا تھا۔ بیلا نے اُس کا "کو" بننے میں کسی طرح کی
ے محسوس نہ کی تھی۔

اوپن ریس تھی۔ چھ دوسری کشتیاں بھی ہوں گی۔ کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ پھر کنور سے
سا؟ ان چار دنوں میں بیلا کنور کے اتنے نزدیک آ گئی تھی۔ دل ہی دل میں اتنا اسے
ند کرنے لگی تھی، اسی طرح کنور اُس کی معمولی معمولی باتوں میں بھی دلچسپی لیتا تھا اور اُس کی
ہش پوری کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ کتنا لائق اور دلچسپ آدمی تھا۔ اگر اس کی شادی
مابن فروخت کرنے والے بے حس اور خشک آدمی کے بجائے اس خوش مزاج اور
رد سے ہوئی ہوتی۔ کئی مرتبہ بیلا کے دل میں یہ خیال آیا تھا۔ کئی مرتبہ اُس نے یہ خیال
میں دبا لیا تھا۔

پنٹو برج پار کر کے جب وہ دونوں کشتی میں بیٹھنے لگے تو بیلا چونک کر رہ گئی۔ اُس
ا کشتی کا نام بدل گیا ہے، جہاں پرملا تھا وہاں سفید حروف میں بیلا لکھا ہے۔ "یہ کیا
بیلا نے کانوں تک سرخ ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں،" کنور بلدیو سنگھ نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ ایک ہی نام ہے۔"
بیلا سر سے پاؤں تک کانپنے لگی مگر کچھ کہہ نہ سکی، کشتی میں بیٹھ گئی۔ کنور اُسے

بادبانی کشتی کے حصّے اور نام سمجھانے لگا۔"دیکھو یہ "ماسٹ بوم" ہے یہ" جیب بوم" ہے
یہ ماسٹ بوم کشتی کا سب سے بڑا بادبان ہے، یہ دوسرا چھوٹا بادبان جیب بوم بادبا
کہلاتا ہے۔" یہ ماسٹ کے نیچے " سنیٹر بوٹ " ہے۔ یہ دو من وزنی رسّے کا ہے۔یہ"
اینڈ ٹیلر" ہے۔"

"اس سے کیا کرتے ہیں؟" بیلا پوچھنے لگی۔

"اس سے کشتی کا رُخ بدلتے ہیں۔ اگر اسے دو تین مرتبہ گھمائیں تو کشتی بائیں طر
گھومے گی اور بائیں طرف گھمائیں تو کشتی دائیں طرف گھومے گی۔ یعنی عورت کی طرح، جد
طرف کرنے کو کہو تو اُس سے اُلٹ کریگی۔"

بیلا زور سے ہنسی۔ "واہ یہ عورتیں کیا ایسی ہوتی ہیں؟ بہت شیطان ہیں آپ
"کشتی کے بائیں طرف کو "اسٹاربورڈ" کہا جاتا ہے اور دائیں طرف کو "پو
بڑے بادبان کو برابر رکھنے کے لئے دو "لپورٹس" ہیں۔ یہ "بک سٹے" ہے، یہ دوسرا
کہلاتا ہے۔"

"یہ سب بتانے کی کیا ضرورت ہے تم مجھے یہ بتاؤ۔ میرا کیا کام ہوگا اس کشتی پ
بیلا نے پہلی بار کنور کو تم کہہ دیا اور تم کہنے کے بعد وہ خود ہی چونک گئی لیکن خ
ہوئی کہ کنور نے اُس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ وہ اس وقت جب سسٹ کی دونوں رسّی
دیکھ رہا تھا۔ وہ بیلا کی طرف مڑے بنا بولا۔ "میرا کام ہے بڑا بادبان سنبھالنا۔ کنور
کو سمجھانے لگا۔ اور سمجھانے کے لئے اُسے بیلا کے بہت نزدیک آنا پڑا۔ دیکھو اس ر
کو "بوم ٹک" کہتے ہیں۔ یہ رسّا کنٹرول کرنے سے "سینٹر بوٹ" اوپر نیچے کیا جاتا
اس کے ساتھ یہ لوہے کا تار ہے یہ ایک پلی ہے۔ یوں گھماؤ۔ یوں کھینچو۔"

بیلا کے ہاتھ کنور کے ہاتھ سے ٹکرا جاتے، کبھی وہ اُس کے بازو اپنے بازو
میں لے کر رسّی کھینچنے کے گُر بتاتا۔ کبھی ایک کی سانس دوسری میں گھُل جاتی۔

ہیں زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا"۔ کنور نے بتایا اور پھر اپنا ہنٹنگ کوٹ اُتار کر بیلا کو تھما
ہا۔ "اُف فوہ! گرمی لگ رہی ہے، خواہ مخواہ ہی یہ ہنٹنگ کوٹ پہن کر آ گیا۔ تم سے
کچھ اور نہیں ہوتا تو میرا یہ کوٹ تو اپنے پاس رکھو!"

اتنے میں ریس شروع ہو گئی۔ ابتدا میں بیلا نے بہت سی غلطیاں کیں چونکہ وہ
ے ہاتھ میں کنور کا ہنٹنگ کوٹ تھامے ہوئے تھی محض ایک ہاتھ سے کتنا کام ہوتا ہے؟
ر نے ایک دو مرتبہ اُسے ڈانٹ بھی دیا۔

مجھ سے یہ کام نہیں ہوتا۔ میں تمہارا کوٹ بھی سنبھالوں اور "جیب بوم" بھی
ِدوں۔ بیلا نے تقریباً آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"ہشت، کوٹ نیچے کشتی میں گرا دو یا پانی میں پھینک دو"۔ کنور نے بڑی بے
ِرائی سے کہا۔ "کوٹ کی پرواہ مت کرو۔ ریس دیکھو۔ ریس عزت کھیلی جا رہی ہے"!

اگلے پندرہ بیس منٹ بیلا، کنور کی ہدایت کے مطابق دل لگائے کام کرتی رہی
۔ جب اُس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں آ گئیں اور اُس کے ہاتھ رسّیاں پکڑنے سے
ل ہو گئے تو کنور نے اسے کونے میں بیٹھ جانے کے لئے کہا اور خود سب کام کرنے
۔ "کو" کا بھی اور "اسکیپر" کا بھی۔ بیلا شرما کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے
تی میں گرا ہوا ہنٹنگ کوٹ اٹھا لیا اور اسے اپنے گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ پھر
ی وقت ہنٹنگ کوٹ اُٹھاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ کوٹ کی دونوں جیبوں
بیشمار سو سو کے نوٹ بھرے ہوئے ہیں۔ کچھ لمحات کے لئے بیلا سنّاٹے میں آ گئی۔
کنور کی طرف دیکھا لیکن کنور پسینے میں تر بتر "سیلنگ" کے کام میں مصروف تھا۔
بیلا نے کنور کی طرف سے نگاہیں ہٹا لیں اور پیٹھ موڑ کر چوری چوری نوٹ گننے
ِ کوشش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد نوٹ گننا چھوڑ دیا مگر اُسے اتنا اندازہ ہو گیا
ازکم پچاس ہزار کے نوٹ ضرور ہوں گے۔ کچھ دیر بعد بیلا نے مسکرا کر کہا۔ "اگر تمہارا

کوٹ پانی میں پھینک دوں تو؟"

"پھینک دو"، کنور نے بہت بے پروائی سے کہا۔ "اس وقت مجھے بدرمت
جانتے ہو، تمہارے کوٹ میں اس وقت پچاس ہزار روپے پڑے ہیں"، بیلا
نے فتح مندانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے!" کنور نے اچانک اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر کہا۔ "میں نے پرسو
دوسرے کوٹ سے اس کوٹ میں رکھے تھے پھر انہیں تجوری میں رکھنا یاد نہیں،
اور آج عجلت میں یہی کوٹ پہن کر چلا آیا"

"پچاس ہزار روپے یوں رکھ کر بھول جاتے ہو؟ کیا تمہاری نگہداشت کر
والا کوئی نہیں ہے؟" بیلا نے اُسے ذرا ہمدردی سے دھمکاتے ہوئے کہا۔

"میری کوئی بیوی تو ہے نہیں"، کنور ذرا تلخی سے بولا "جس عورت کو پسند کرتا ہو
وہ کسی دوسرے سے شادی شدہ نکلتی ہے"۔

اتنا کہہ کر کنور پھر اپنے کام میں محو ہو گیا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں، اس نے کچھ کہا ہ
نہیں ہو، کسی نے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔ لیکن بیلا کا دل اندر سے پگھلنے لگا۔ ایک وہ ہ
فروخت کرنے والا ہے جو پیسے پیسے کا حساب مجھ سے لیتا ہے اور ایک یہ عظیم دل گرد
کا انسان ہے جو میری ایک نگاہ پر پچاس ہزار روپے پانی میں بہانے کی جرأت رکھ
ہے، جو مجھے اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔ روپے؟ روپے کی تو اسے
پرواہی نہیں۔ اسے یہ تک نہیں معلوم کہ کون سی جیب میں کتنے روپے رکھے ہیں۔ ا
وہ ہے جو سانس کی ایک ایک ٹک ٹک تک گن لیتا ہے۔ حالانکہ کتنی دقت سے آ
ہوں۔ بیلا نے بہت دیر بعد رُک رُک کر کہا۔ "تم چاہو تو میں تمہارے لئے ساری
بھی چھوڑ سکتی ہوں"۔ کب اُس کے مُنہ سے یہ بات نکلی؟ کیوں کر اس نے اتنی بڑ
بات کہہ دی۔ اس نے کہنے کو تو کہہ دیا پھر فوراً کانپ گئی اور پھر شرم سے سُرخ ہو کر ا

والے کوٹ پر دُہری ہوگئی۔

"پھر بات کریں گے۔" کنور نے بے پروائی سے کہا۔ "اس وقت ریس نکلی جارہی ہے۔"

آہستہ آہستہ بیلا نوٹ والے کوٹ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اُسے کوٹ پر بڑا پیار آنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ہمیشہ سے یہ کوٹ اُس کا تھا۔ ہمیشہ سے صرف اُس کا اس پر حق تھا۔

کنور بلدیو سنگھ نے بڑی پھرتی سے "جپ بیلٹ" سے چھوٹا بادبان اُونچا کیا اور پھر باز جیسی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بادبانی کشتی ریس میں سب سے آگے لے جاتے ہوئے زور سے کہا۔ "وہ مارا۔"

کنور اور بیلا ریس جیت گئے تھے۔ بیلا کو جب کپ ملا تو سارے کلب کے ممبروں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ پھر کنور اور بیلا کا اکٹھا فوٹو لیا گیا اور ان دونوں کا جام صحت پیا گیا۔ بڑی دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اور ایک دوسرے کے جام صحت پیتے جاتے رہے۔ چلتے چلتے کنور نے بیلا سے پوچھا۔ "آج شام کو کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"میں آؤں گا۔" کنور نے بڑے اطمینان سے اپنا ہنٹنگ کوٹ پہنتے ہوئے کہا "کہیں گھومنے چلیں گے، اکٹھے کھانا کھائیں گے۔"

اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کنور وہاں سے چلا گیا۔ بیلا لاؤنج کے کونے میں اکیلی کھڑی کھڑی خوف اور خوشی کی مشترکہ کیفیتوں سے کانپنے لگی۔

اگلے تین چار دن اُن دونوں کے ایسی سنہری دھوپ میں گزرے جہاں بادلوں کا سایہ تک نہ تھا۔ ایک دھیمی دھیمی جھلملاتی ہوئی روشنی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ سمندر کا پانی سنسناتا تھا اور ہوا میں ابابیلیں اُڑتی تھیں۔

پرم رائے چوہدری آگیا اور اچانک کنور ایسے الگ ہوگیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں

تھا۔ بیلا دھک سے رہ گئی۔ وہ چھپ چھپ کر کنور کے پاس جاتی مگر کنور وہاں سے ٹل جاتا۔ وہ اُسے بلانے کے لیے درد بھری نگاہوں سے تاکتی اور کنور یوں دیکھتا جیسے آنکھوں سے اندھا اور کانوں سے بہرا تھا اور اپنے سینے میں دل کے بجائے محض ایک ہٹنگ کوٹ رکھتا تھا۔

دوسرے دن بیلا کی روتی ہوئی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر لالہ گردھاری لال نے کنور سے پوچھا۔ "یار ہمیں بھی بتا دو، تمہارے کوٹ میں کیا ہے؟ کیا رکھتے ہو اپنے ہٹنگ کوٹ میں؟ کوئی گیدڑ سنگھی ہے یا کوئی تعویذ ہے؟"

کنور بلدیو سنگھ نے مسکرا کر کہا۔ "لالہ اس کوٹ میں اس زمانے کا سب سے بڑا تعویذ ہے۔"

پھر کنور بلدیو سنگھ لالہ کے پاس سے اُٹھا اور رضیہ عطاء اللہ کے پاس جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد یاروں نے سُنا کہ اُن دونوں میں بڑے زور کی بحث چل رہی ہے اور کنور بلدیو سنگھ میز پر ہاتھ مار مار کر کہہ رہا ہے۔ "اجی چھوڑو۔ میری سمجھ میں نہیں آیا، ٹیگور بھی کوئی شاعر ہے؟ مسز رضیہ عطاء اللہ! میں آپ سے کہتا ہوں، دُنیا میں صرف ایک شاعر ہے اور کنور بلدیو سنگھ کا ایک شاعر ممدوح ہے اور وہ شاعر ہے اقبال۔ اقبال کا جواب دُنیا میں نہیں۔

لیڈر کی کُرسی

اسماعیل بھائی لونڈے والا کا نیلام گھر محمد علی روڈ اور بھنڈی بازار کے قریب پوسٹ آفس کے سامنے واقع تھا۔ کل اتوار ہونے کی وجہ سے نیلام گھر میں ہر طرح اور ہر عمر کا فرنیچر جمع تھا۔ اسماعیل بھائی لونڈے والا آدھی رات کے قریب نیلام گھر کو تالا لگا کر چلا گیا لیکن جلدی میں اندر کی بتی بجھانا بھول گیا سو کینڈل پاور کے بلب کی تیز روشنی میں بھلا فرنیچر کو کیسے نیند آتی چنانچہ گھڑیال کے مشورے پر رات بتانے کے لئے سب نے اپنی اپنی آپ بیتیاں سُنانا منظور کر لیا۔ کتابوں کا ریک جب اپنی کہانی سُنا چکا تو کرسی نے کہا۔ اب میری کہانی سنیئے:

لیڈر کی کرسی بہت پرانی تھی۔ اس کی تین ٹانگیں تو ٹھیک تھیں لیکن چوتھی ٹانگ بڑی بھدی اور بدشکل تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اصلی ٹانگ ٹوٹنے کے بعد کسی اجڈ بڑھئی نے جلدی سے لگا دی ہے۔ پُشت پر چمڑا لگا تھا جو متواتر استعمال سے گھس گیا تھا اور اس کی سطح پر متواتر رگڑ سے لیڈر کی پیٹھ کا نشان پڑ گیا تھا۔ یہ نشان اتنا بڑا تھا کہ اس پر ہماری قومی آزادی کی جدوجہد کی پوری تاریخ لکھی جا سکتی تھی۔ کرسی کی سیٹ پر نیلی مخمل کی روئی دار گدی جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی اور اس میں سے پھوسڑے نکل کر باہر جھانک رہے تھے۔ کرسی کا پالش بہت پُرانا تھا اور کئی رنگ کا تھا، کہیں سے سیاہ کہیں سے بھورا اور جو چوتھی ٹانگ تھی، وہ پھیکے بادامی رنگ کی تھی اور کرسی کو دیکھ کر بہت سے فرنیچر جو ایک ہی ساخت، ایک ہی رنگ اور ایک ہی لکڑی کے بنے، زور زور سے ہنس پڑے۔ کرسی نے خفا ہو کے کہا "میری بری شکل پر مت ہنسو، کبھی میں بھی تمہاری طرح جوان تھی اور خوبصورت تھی۔ استبداد زمانہ نے میرا یہ حال کر دیا ہے مگر زمانے نے کب کسی کا ساتھ دیا ہے، ہر فرنیچر جو پیدا ہوتا ہے، ایک روز بوڑھا ہوتا ہے اور سڑ جاتا ہے۔ یہی اس زمانہ کا دستور ہے۔"

"سچ ہے سچ ہے" ایک بوڑھا پلنگ کھانس کر بولا۔

"خیر اب تم میرا قصہ سنو" کرسی ایک آہ بھر کر بولی "میں بھی زندگی کے بہت سے تجربے اپنے ساتھ لائی ہوں۔ میں شہر ہیم پور کی کرسی ہوں۔ ہمارے شہر کی آبادی سات لاکھ سے اوپر ہے، آدھی آبادی مرہٹوں کی ہے، آدھی یوپی والوں کی۔ یہ مدھیہ اتر پردیش کی راج دھانی ہے لیکن یہاں ایک بھی کارخانہ نہیں —— ہاں

پاگل خانے گیارہ ہیں۔"

"ایسا کیوں ہے؟" ایک لیپ شیڈ نے پوچھا۔

"جب بھی سرکار یہاں کوئی کارخانہ لگانے کا سوچتی ہے، مراٹھے کہتے ہیں، کارخانہ ہماری آبادی والے حصے میں کھلنا چاہیئے۔ یوپی والے کہتے ہیں، نہیں اسے ہماری والے حصے میں کھلنا چاہیئے۔ آج سے کچھ عرصے پہلے سرکار نے بیم پور میں شکر کی فیکٹری کھولنے کی منظوری دے دی۔ منظوری بڑی مشکلوں سے حاصل کی گئی تھی اور مرکزی سرکار سے بہت لڑ جھگڑ کے حاصل کی گئی تھی لیکن جب اسے عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو شہر میں جھگڑا شروع ہو گیا یوپی والے کہتے تھے چونکہ گنا یوپی کے دیہاتوں سے آتا ہے اس لئے فیکٹری ان کے علاقے میں کھلنی چاہیئے۔ مراٹھے کہتے تھے کہ چونکہ کارخانے میں کام کرنے والے مزدور مراٹھے ہوں گے اس لئے یہ فیکٹری ان کے علاقے میں کھلنی چاہیئے نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں دو پارٹیاں ہو گئیں دونوں پارٹیاں الگ الگ جلسے کرنے لگیں شہر میں زبردست ہڑتال ہوئی سب دکانیں بند، اسکول، کالج، دفتر سب بند ہو گئے۔ بجلی گھر کے ملازمین نے بھی ہڑتال کر دی اور جب شہر میں بجلی نہ رہی تو جلسوں میں بجلی کہاں سے آتی؟ اور مائیکروفون، لاؤڈ اسپیکر کہاں سے کام کرتے؟ چنانچہ اچھے اچھے تقریر کرنے والوں کے دم اکھڑنے لگے مگر چونکہ شہر میں ہڑتال تھی اور لوگوں کے پاس کوئی کام نہ تھا اس لئے ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے جلسے ہونا بہت ضروری تھا اس لئے ایسے لوگوں کی ڈھنڈیا پڑی جو مائیکروفون کے بغیر ہی تقریر کر سکیں۔ ایسی ایک ضرورت نے زمانہ حال کا وہ لیڈر پیدا کیا جس کی کرسی میں ہوں۔"

کرسی یہاں تک کہہ کر ایک لمحے کے لئے رکی پھر اس نے داستان جاری رکھتے ہوئے کہا

"ابھی دونوں کی بات ہے۔ ہمارے شہر بیم پور کے تیلیوں کے محلے میں بھیکو نامی ایک شیرفروش رہتا تھا۔ اس کا کام پہلے تو بہت نہیں چلتا تھا لیکن جب سے سرکار نے دودھ کے بجائے پانی میں چونا، میدہ، کھریا مٹی، سفید لکڑی کا برادہ، غرض کہ پانی میں کوئی بھی سفید چیز ڈال کر اسے دودھ کے نام سے بیچنے کی اجازت دی تھی بھیکو کا کام خوب چل نکلا تھا یوں بھیکو بہت شریف آدمی تھا اسے صرف اپنے کام سے غرض تھی اور دوسروں کی بے ایمانی سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے بھیکو کو بہت تکلیف پہنچی، جب اس کا بڑا لڑکا گوبند آٹھویں میں فیل ہو کر گھر بیٹھ گیا اور اس نے دودھ بیچنے سے انکار کر دیا۔ میں آٹھویں میں فیل ہو کر دودھ بیچوں، یہ قطعی ناممکن ہے گوبند نے صاف انکار کر دیا اور جب بھیکو نے غصے میں آکر اپنے بیٹے کو پیٹنا چاہا تو گوبند لاٹھی لے کر کھڑا ہو گیا۔ گوبند اچھ فٹ سے اونچے

قد کا تھا۔ اس کے بڑے نتھنے پھولے ہوئے رہتے اور رخسار اندر دھنسے ہوئے تھے جس سے اس کے جبڑے اور بھی مضبوط دکھائی دیتے تھے اس کی آنکھیں سیاہ چمکیلی اور چھوٹی چھوٹی لیکن اس کی آنکھوں پر اس کی بھویں بڑی بڑی سیاہ اور گھنے بالوں والی تھیں جنہوں نے اس کی آنکھوں کی چمک میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس کا ماتھا تنگ، اور گھٹا ہوا تھا، اور ہونٹ لمبے لمبے اور بڑے بڑے تھے اس کے منہ کا دہانہ بہت بڑا تھا لیکن ان سب سے بڑی اس کی آواز تھی وہ جب بولتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اس کے حلق کے اندر ایک لاؤڈ اسپیکر لگا دیا ہے۔ پڑھنے لکھنے میں اس کا جی مطلق نہ تھا وہ سات بار آٹھویں میں فیل ہو چکا تھا اور آٹھویں بار فیل ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ بھیکو نے اسے اسکول سے اٹھا لیا اور اس کے دودھ بیچنے سے انکار پر اسے اپنے دوست چمن بیڑی فروش کی بیڑیاں بیچنے پر لگا دیا۔ چمن بیڑی فروش کی اصلی بنارسی تمباکو والی نمبر ون بیڑی ان دنوں شہر میں بہت بکتی تھی جس کا تمباکو پرانی بڑی گھاس، ڈھاک کے پتے اور گوبر کی شاخیں کوٹ کوٹ کر انہیں تمباکو کی مہک دے کر تیار کیا جاتا۔ چمن بیڑی فروش نے گوبند کو اپنے ہاں دو روپے روزینہ پر ملازم رکھ لیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ دو چار لونڈے اپنے ساتھ لے کر اور ایک ٹھیلا لے کر شہر کے گلی کوچوں میں چلا جاتا اور کھڑا ہو کر اپنی گرجدار بلند آواز میں میاں چمن کی اصلی بنارسی تمباکو والی نمبر ون بیڑی کی تعریف کرتا تھا اور لوگوں کو اسے استعمال کرنے پر آمادہ کرتا۔ گوبند کو یہ کام بہت پسند آیا ایک تو اسے اپنی آواز استعمال کرنے کا اچھا موقع مل گیا پھر اس کے سر پر جو پھندنے دار ٹوپی ہوتی تھی اور ہاتھ میں جو گھنٹیاں ہوتا تھا اور پیچھے پیچھے دس لڑکوں کا لاؤ لشکر ہوتا تھا، وہ سب اسے بے حد پسند تھا اور گویا اس کی مرضی کے عین مطابق تھا لہٰذا بھیکو دودھ فروش بھی بہت خوش ہوا کہ چلو اس کا لڑکا ٹھکانے سے کام پر لگ گیا۔ ایک دن جب وہ اتفاق سے چیلا پیلی بین کے ناکے پر کھڑا ہوا اپنی گرجتی گونجتی آواز میں بیڑیاں بیچ رہا تھا، ادھر لوہے والوں کا ایک جلوس نکلا جو "شوگر فیکٹری ہماری ہے" کے نعرے لگاتا ہوا گھوڑا میدان میں جلسہ کرنے کے لئے جا رہا تھا۔ جلوس کے لوگ نعرے لگا رہے تھے "شوگر فیکٹری ہماری ہے"

اور گوبند چلا رہا تھا "بیڑی نمبر ون ہماری ہے"

مگر سارے جلوس پر گوبند کی آواز بھاری تھی لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے اور آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جب جلوس آگے بڑھا تو گوبند نے کیا دیکھا کہ دو آدمی جواہر جیکٹ اور دھوتی پہنے ہوئے آپس میں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر کھسر پھسر کر رہے تھے پھر تھوڑی دیر بعد وہ دونوں آدمی اس کے قریب آئے

اور کہنے لگے : " یہ کیا بیڑی بیچنے کا کام کرتے ہو؟ کوئی اچھا سا دیش سیوا کا کام کرو۔"

"بیڑی بیچنے میں مجھے دو روپے روز ملتے ہیں دیش سیوا کے کام میں مجھے کیا ملے گا؟ گوبندے نے فوراً پوچھا۔

" وہاں تمہیں پانچ روپے روز ملیں گے۔"

" تو مجھے دیش سیوا منظور ہے" ان آدمیوں نے گوبندے سے ہاتھ ملایا، اس کی پیٹھ تھپکی پھر گوبندے نے پوچھا " مگر یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کام کیا ہوگا؟"

ایک آدمی نے جس کی جواہر جیکٹ دوسرے سے زیادہ خوش نما تھی، اپنی جیب تھپتھپاتے ہوئے کہا " آج رات تمہیں بڑا گھوڑا میدان میں ایک تقریر کرنی ہوگی؟"

" بیڑی نمبر ون کی حمایت میں؟" گوبندے نے پوچھا

" نہیں، شوگر فیکٹری یوپی والوں کی ہے، اس بات کی حمایت میں۔"

" مگر مجھے تقریر کرنی نہیں آتی۔"

" وہ تم رہنے دو، وہاں تمہیں کیا بولنا ہے، وہ سب ہم بتا دیں گے، ہمیں فقط تمہاری آواز چاہیئے۔"

اور یہ بات تھی بھی سچ۔ بجلی نہ ہونے سے مائکروفون نہیں ملتے تھے اور مجمع آہستہ بولنے والے مقرروں کی تقریروں سے بور ہو جاتا تھا۔ اس لحاظ سے گوبندے کی گرجتی گونجتی پاٹ دار آواز بہت کامیاب رہی اور پھر گوبندے کو خود اپنی آواز بہت پسند تھی۔ وہ اسے سنتے ہی چلا جانا چاہتا تھا اس لئے جو کچھ ان دونوں آدمیوں نے اسے پڑھایا تھا، وہ اس سے کچھ زیادہ ہی بول گیا، دو ایک لطیفے اس نے اپنے پاس سے بڑھا دیئے جو بہت کامیاب رہے۔ غرض اس دن کا جلسہ بہت کامیاب رہا۔ خوش نما جواہر جیکٹ والے آدمی نے جس کا نام اسے بعد میں معلوم ہوا کہ کالی چرن ورما ہے اور وہ شہر کا میونسپل کمشنر ہے، اس کی خوب پیٹھ ٹھونکی اور اس سے کہا

" آج سے تو لیڈر ہو گیا ہے گوبندے!"

گوبند خوش ہو کر بولا "سرکار! سنتا ہوں، ہر لیڈر کے پاس ایک کرسی ہوتی ہے میرے گھر میں

تو ایک کرسی بھی نہیں ہے "

تب کالی چرن ورما نے اسی دن مجھے گپتا فرنیچر مارٹ سے خریدا اور اسی روز گوبندے کے گھر پہنچا دی گئی۔ گوبندا مجھ پر پہلی بار بیٹھ کر بہت خوش ہوا اور اپنے باپ اور ماں اور بھائی بہنوں کے سامنے بیٹھ کر لات پر لات رکھ کر شیخی بگھارنے لگا۔

" پانچ ہزار آدمی کا مجمع تھا، انھوں نے پھولوں کے ہار پہنائے، جے کالے لگائے، اب میں لیڈر ہو گیا ہوں باپو! لیڈر "

اس کا باپ بھیکو جو ابھی ابھی بھینس کا دودھ دوہ کر آیا تھا، وہ پریشانی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دودھ کا مٹکا پانی کے نل کے نیچے رکھ دیا اور بولا

" بیٹا! لیڈری میں کیا رکھا ہے، دو دن کی چاندنی ہے پھر لیڈری دھری کی دھری رہ جائے گی، دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جائے گا لیکن ہمارا خاندانی دھندا سب سے اچھا ہے جس میں دودھ اور پانی اگر ایک دفعہ مل جائیں تو پھر کبھی الگ نہیں ہوتے " بھیکو دیر تک دودھ کے مٹکے میں گرتی ہوئی پانی کی دھار دیکھتا رہا اور جب مٹکا لبالب بھر گیا تو اس نے پہلا مٹکا اٹھا کے اس کی جگہ دوسرا دودھ کا مٹکا رکھ دیا۔

گوبندے نے ازکار میں سر ہلا کے کہا " باپو! جو کام تم کرتے ہو، اس میں عزت نہیں ہے میں ایسا کام نہیں کروں گا، میں تو بس عزت والا کام کروں گا اور لیڈری سے بڑھ کر عزت کس بات میں ہے؟" بھیکو چپ ہو گیا بیٹے نے بات ٹھیک کہی تھی۔

گوبندے کی پاٹ دار آواز نے یوپی والوں کے مخالفوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ ان کے جلسے میں لوگوں کی تعداد ہر روز بڑھتی گئی۔ آخر ایک روز، شوگر فیکٹری مراٹھوں کی ہے" کی تحریک کا صدر بابو ہمت راؤ پنڈھارکر رات کے دس بجے گوبندے کے گھر پہنچا۔ جب گوبندا مجھ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا گھر والوں پر رعب جما رہا تھا۔

ہمت راؤ پنڈھارکر نے پوچھا " یہ یوپی والے تمہیں کیا دیتے ہیں؟ "

"پانچ روپے ایک بھاشن کے دیتے ہیں"

"ہم دس روپے دیں گے، بولو ہمارے لئے کام کرو گے؟"

"کروں گا کیوں نہیں؟ گوبندا خوش ہو کے بولا " یوپی والے پانچ روپے دیتے ہیں۔ اس سے پہلے اصلی بنارسی تمباکو والی بیڑی نمبر ون والے صرف دو روپے دیتے تھے، آپ دس روپے دیتے ہیں تو میرا سر پھرا ہے جو آپ کا کام نہ کروں گا"

اس دن سے گوبندے نے شوگر فیکٹری مراٹھوں کی ہے' والوں کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ وہی بھاشن، وہی آواز، وہی گوبندا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے جہاں جہاں یوپی والوں کا ذکر آتا تھا، وہاں اب مرہٹوں کی حمایت میں بات ہونے لگی۔ بابو ہمت راؤ پنڈھارکر نے گوبندے کی ہمت بندھوائی۔ بھرے جلسے میں اس کا تعارف شری گوبند رام کہہ کر کرایا اور اسے ایک انصاف پسند یوپی والے' کے خطاب سے نوازا۔ گوبندے نہیں، گوبند رام کے کہنے پر پنڈھارکر نے اس کے لیے ایک میز بھی خرید کر دی جو میرے سامنے رکھ دی گئی میری پشت پر اعلا نرم چمڑے کا ایک غلاف چڑھایا گیا جو آج تک آپ مجھ پر دیکھ سکتے ہیں۔ اب گوبندا اکثر مجھ پر بیٹھ کر اور اپنی ٹانگیں میز پہ پسار کر گھر والوں سے اپنی کامیابی کی باتیں کیا کرتا تھا اور محلے والوں پر رعب گانٹھا کرتا تھا، محلے والے بھی اب اس سے ڈرے ڈرے رہنے لگے تھے اور اس کی عزت کرنے لگے تھے۔

گوبند رام کی لیڈری چمکنے لگی۔ پہلے یوپی والوں پھر مرہٹوں کے لئے کام کرنے سے اس کا سارے شہر میں شہرہ ہو گیا۔ وہ ایک بار تو اس نے یہاں تک کر لیا کہ شام کو یوپی والوں کے لئے تقریر کی اور رات کو مرہٹوں کے جلسے میں جا کر بول آیا اور دونوں طرف سے پیسے وصول کر لیے اور جب لوگوں نے پوچھا کہ " یہ تم نے کیا کیا؟ " تو اس نے جواب دیا

" بھائی! شوگر فیکٹری مرہٹوں کے علاقے میں جائے یا یوپی والوں کے حصے میں کھلے رہے گی تو سیم پور میں"

پنڈھارکر نے اسے زیادہ نہیں ڈانٹا کیونکہ گو اب بجلی کی ہڑتال کھل گئی تھی اور شہر میں بجلی آگئی تھی پھر بھی جلسے کے لئے مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر کرائے پر لینے میں پچاس ساٹھ روپے نکل جاتے تھے

اور یہاں صرف دس روپے خرچ کرنے پر ایک عمدہ انسانی لاؤڈ اسپیکر ہاتھ آجاتا تھا مگر پندرہ بیس دنوں بعد ہی گوبندے کی لیڈری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ہوا یہ کہ سرکار نے یوپی والوں اور مراٹھوں کی روز روز کی چپقلش سے تنگ آکر یہ فیصلہ کیا کہ ہیم پور میں ایک سرے سے شوگر فیکٹری لگائی ہی نہ جائے۔ انھوں نے اس کام کے لئے مدراس شہر کو چن لیا اور اس طرح ایک اور کارخانہ ہیم پور میں کھلنے سے رہ گیا، ہاں اس واقعے کے بعد دو پاگل خانے اور شہر میں کھل گئے، کھلنا ہی تھا ان کو۔

اس واقعے کے بعد کئی ماہ گوبندا بے کار رہا۔ بیڑی نمبر ون اب وہ بیچ نہیں سکتا تھا حالانکہ جمن بیڑی فروش نے اب اس کی بڑھتی ہوئی شہرت کے پیش نظر اسے تین روپے روز پر ملازم ہو جانے کی دعوت دی تھی جسے گوبند رام نے بہ صد تحقیر ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا بولا "اب میں بیڑی بیچوں گا؟ کیا بات کرتے ہو تم باپو! میں اب کوئی بڑی شے ہی بیچوں گا۔ مجھ سے تم کوئی شوگر فیکٹری کھلوالو، کوئی توم بکوالو، کوئی ملک نیلام کروالو مگر اب مجھ سے یہ بیڑی نہیں بیچی جائے گی"

اس کا باپ چپ ہو گیا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا کہ اس کا لڑکا پھر بے کار ہے۔ آخر سوچ سوچ کر اس نے گوبندے کا بیاہ اپنی جات برادری میں کر دیا۔ روپا اس کی بہو گو بہت سندر تو نہ تھی اور پڑھی لکھی تو بالکل نہ تھی مگر بھینس کا دودھ دوہنے میں لاثانی تھی۔ اس لئے بھیکو نے روپا کا ناتا منظور کر لیا پھر اس نے یہ بھی سوچا لڑکا بے کار ہے، کام نہیں کرتا ہے مگر جب گھر میں بہو آجائے گی اور گرہستی بڑھے گی تو خود ہی کام کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

دن گزر گئے، مہینے گزر گئے لیکن گوبندے کو کوئی کام نہ ملا۔ ہیم پور میں نہ کوئی کارخانہ کھلا، نہ کوئی جھگڑا ہوا۔ اس اثنا میں میرا چہرا گھس گیا تھا، میری پشت پھٹ چکی تھی۔ گوبندا بھی پہلے سے موٹا، پہلے سے بدمعاش، پہلے سے چالاک ہو گیا تھا۔ روپا کی گود میں تین بچے کھیلتے تھے۔ وہ تو کہو کہ بھیکو کے گھر میں دودھ کی برکت تھی کہ گھر چلتا رہا اور گوبندا کھا کھا کر موٹا ہوتا رہا اور گلی محلے میں اپنی لیڈری کا خالی خولی رعب گانٹھنے کی کوشش کرتا رہا ورنہ اب تک بے کاری سے مر گیا ہوتا۔

تین سال بعد گوبندے کے دن پھرے۔ ہوا یہ کہ سر پر میونسپل الیکشن آگیا۔ شہر میں دھڑے بازیاں اور پارٹیاں، جلسے اور جلوس اور تماشے، باجے گاجے اور تقریریں پھر سے شروع ہونے لگیں۔ اب کے گوبندے نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اس نے سب دھڑے بازیوں اور پارٹیوں کا غور سے مطالعہ کیا اور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شہر میں "سسبک" پارٹی کے جیتنے کا سب سے زیادہ امکان ہے۔ سسبک پارٹی کا نام پارٹی کے عقیدے سے لیا گیا تھا جو یہ تھا، "سب سے جنگ کرو"۔ اس فقرے کے ہر لفظ کا پہلا حرف لے کر پارٹی کا نام "سسبک" رکھ دیا گیا تھا۔ گوبندے کو یہ پارٹی بہت پسند آئی تھی۔ یہ اُس کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ پارٹی میں شامل ہونے سے پہلے گوبندا اس کے جلسے میں ایک تقریر سُننے گیا۔ ایک نوجوان غصے سے منہ لال کئے چلا رہا تھا

"لنکا والے ہم ہندوستانیوں کو شہریت نہیں دیتے، کیا کرنا چاہیئے؟"

"جنگ کرو"۔ مجمع زور سے چلّا پڑا۔

"جنوبی افریقہ والے ہم کو کالا سمجھ بے عزت کرتے ہیں۔ بولو، کیا کرنا چاہیئے؟"

"جنگ کرو"۔ مجمع اور بھی تیزی سے چلّایا۔

انہی دنوں پاکستان کے وزیرِ اعظم نے ایک تقریر میں ہندوستانیوں کو مکا دکھایا تھا، بس پھر کیا تھا گوبندے کے ہاتھ میں معاملہ آگیا۔ اس نے دوسرے دن سسبک پارٹی کے بھرے جلسے میں ایک پستول داغ دیا اور ایک بے حد جوشیلی تقریر کے دوران کہا "جو ہمیں مکا دکھائے گا، ہم اس پستول سے اس کا سینہ چھلنی کریں گے"۔

مجمع جوش میں آگیا۔ ساری فضا گوبند رام زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی لوگ بیحد اشتعال میں آکر طرح طرح کے نعرے لگانے لگے گوبند رام کی مقبولیت بے حد بڑھ گئی جس کے پیشِ نظر سسبک پارٹی کے لیڈروں کو گوبند رام کا نام میونسپل کمشنری کے امیدواروں کی لسٹ میں شامل کرنا پڑا۔

گوبند رام اپنے حلقے سے میونسپل کمشنری کا امیدوار تو ہو گیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا ہوا یہ کہ اس کی تقریر کے چند روز بعد پولس نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس پر یہ الزام تھا کہ:

۱۔ اس نے بھرے جلسے میں پستول چلایا

۲۔ پستول کا لائسنس اس کے پاس نہیں تھا۔

۳۔ اس نے ایسی اشتعال انگیز تقریر کی جس سے ملکوں اور قوموں کے درمیان منافرت پھیلنے کا اندیشہ تھا۔

گوبند رام کو ڈھائی سال قید بامشقت ہوئی۔ ادھر اس کی سسبک پارٹی بھی میونسپل الیکشن ہار گئی جس کا مقولہ تھا "سب سے جنگ کرو" جیت دوسری پارٹی کی ہوئی جس کا مقولہ تھا "سب سے صلح کرو" یعنی سسبک پارٹی کی۔

ان ڈھائی سالوں میں میرا تو حلیہ ہی بگڑ گیا۔ مجھ پر وقت بے وقت دودھ کے مٹکے اور پانی کے گھڑے رکھے جانے لگے۔ کبھی کوئی چھوٹا بچہ مجھ پر بیٹھ کر پیشاب کر دیتا کبھی بڈھا بھیکو اپنی میلی دھوتی سے رائیں کھا کھا کر میرے ڈنڈوں سے طبلے کا کام لے کر آلھا اودل گانے لگتا۔

ایک بار بچوں نے مجھے اُلٹا کر دیا تھا اور اِدھر اُدھر گھسیٹ کر لے جانے لگے۔ اسی طرح میں گھر کی سیڑھیوں سے نیچے گر گئی اور میری ٹانگ ٹوٹ گئی وہاں کون میری خبر گیری کرنے والا تھا۔ گوبند تو جیل میں تھا۔ خود ہی بھیکو نے محلے کے کسی تھرڈ کلاس بڑھئی کو بلا کر مجھے ٹھوک ٹھاک کر بیٹھنے کے قابل کیا۔ یہ چوتھی ٹانگ اس بڑھئی کی عطا کردہ ہے اور یہ غضب کا بادامی پالش بھی اسی کا ہے۔

خیر صاحب! ڈھائی سال بھی کسی نہ کسی طرح رفتے دھوتے گزر گئے اور گوبند جیل سے چھوٹا تو میں اس کی ہیم پور کے مشہور غنڈوں سے شناسائی ہو گئی تھی اور اب جو وہ جیل سے آیا تو شہر کے اندرون پردہ سے بخوبی واقف ہو کے لوٹا اور اپنا اثر و رسوخ ان غنڈوں سے پیدا کر کے لوٹا۔

جیل سے باہر نکلنے کے بعد سسبک پارٹی یعنی سب سے جنگ کرو پارٹی کے ممبروں نے اس میں ہار پہنائے، اس کی قومی خدمات کو سراہا۔ اس کی قومی قربانیوں کی تعریف کی۔ گوبند رام نے مختصر سا اس کا شکریہ ادا کیا اور ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ کر کے گھر بیٹھ گیا۔

میونسپل الیکشن اب پھر سر پر آ رہا تھا اور بہت لوگوں کو جو ٹوہ رکھتے تھے، انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ گوبند رام شہر کے کن لوگوں سے متعلق ہو چکا ہے اور کتنے ہی سینکڑوں ووٹ وہ ان کو دلوا سکتا ہے۔ گوبند رام نے اُن لوگوں کا اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے گھر کے آگے ایک بیٹھک بنانے کی اجازت

حاصل کرلی، ایک ٹیلی فون لگوالیا۔ بیٹھک نئے ساز و سامان سے نئے فرنیچر سے سجائی مگر مجھے نہ بدلا۔ کمرے کی ہر چیز بدل گئی مگر میں اس کی کرسی وہی کی وہی رہی۔ گوبند رام اکثر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کرتا تھا "یہ میری لیڈری کی پہلی نشانی ہے میرے برے دنوں کی ساتھی ہے، میں اسے کبھی نہ بدلوں گا۔"

لوگوں میں، سرکاری حلقوں میں، کاروباری حلقوں میں اس کا رسوخ خود بخود بڑھتا گیا۔ وہ لوگوں کے طرح طرح کے کام کرنے لگا اور طرح طرح کے کام ان سے لینے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی جوشیلی ڈھب کی شہرت ختم ہوتی گئی اور اب وہ شہر کا ایک معزز شریف، سنجیدہ، متین شہری سمجھا جانے لگا۔

اب کے میونسپل الیکشن میں اس نے سسمک پارٹی کا ساتھ دیا اور اس کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑا ہوا۔ سسمک پارٹی کا مقولہ تھا "سب سے صلح کرو" چنانچہ اس بار گوبند رام سب کے ساتھ چیز جاپان، لنکا، پاکستان، افریقہ، ایران، توران، افغانستان اور بالنجان، سب کے ساتھ صلح کا حمایتی بن گیا۔ اُن دنوں اس کا چہرہ ایسا بھیگا بھیگا سا چکنا، چپڑاسا، ایک ایسی صلح کن مسکراہٹ میں لتھڑا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی چہرہ نہ ہو، کسی بناسپتی گھی کے ڈبے کا اشتہار ہو۔

تھوڑے دنوں میں میونسپل الیکشن کا نتیجہ نکل آیا۔ اب کے نہ سسمک پارٹی کامیاب ہوئی جس کا مقولہ تھا "سب سے جنگ کرو" نہ سسمک پارٹی جس کا مقولہ تھا سب سے صلح کرو، کھسک، کبک پارٹی کامیاب ہوئی جس کا مقولہ تھا "کبھی صلح کرو، کبھی جنگ کرو۔"

گوبند رام پھر ممبر ہوتے ہوتے رہ گیا مگر اب کے اُسے اس کا زیادہ افسوس نہیں ہوا۔ ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ لیڈری کی بنیادیں مضبوط ہونی چاہئیں ورنہ لیڈری زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ مختلف رابطے قائم کرنے چاہئیں اور جو کوئی جو چیز مانگے اُسے وہی دینے کی کوشش کرے۔ صرف وہی پارٹی کامیاب ہو سکتی ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ووٹ دیتے وقت خوش کر سکے۔ اصول بہت عمدہ اور خوش نما ہونے چاہئیں لیکن ان کے اندر کوئی نہ کوئی پیچ ایسا ہونا چاہیئے

مطابق گھما کر فوراً بدل دیا جا سکے۔ بہت سوچ سوچ کے گوبند رام نے ایک نئی پارٹی
کا مقولہ تھا تمہارا کس میں فائدہ ہے؟ اس نے شہر کے بہت سے ذی ثروت اصحاب کو
سُن کے اپنے ساتھ ملا لیا اور میونسپل الیکشن سے بہت پہلے اس پارٹی کی بُنیادیں مضبوط کر لیں
رام نے اس کا منشور پیش کرتے وقت لوگوں کے سامنے جو تقریر پیش کی وہ پارٹی کی مکمل طور
رہنمائی کرتی تھی۔ گوبند رام نے کہا " ہماری پارٹی صرف یہ بات مدنظر رکھے گی کہ تمہارا کس میں فائدہ
ہے؟ انکم ٹیکس بڑھانے میں یا گھٹانے میں؟ شہر کی سڑکیں چوڑی کرنے میں یا تنگ کرنے میں؟ بجلی
ا ریٹ کم کرنے میں یا زیادہ کام کرنے میں؟ ہماری پارٹی صرف وہی کام کرے گی جس میں تمہارا فائدہ ہو گا"
بات معقول تھی، لوگوں کو جچ گئی۔ میونسپل الیکشن کے دوران صاف نظر آنے لگا کہ جیت اسی
رٹی کی ہو گی جس کا مقولہ تھا، تمہارا کس میں فائدہ ہے؟"
اس پروگرام کے تحت گوبند رام نے دھوبیوں کے ریٹ بڑھانے اور صابن کے ریٹ کم کرانے
ے لئے ہاں کر دی، نلکوں میں پانی کی مقدار بڑھانے اور پانی کا چارج کم کرنے کی سفارش کر دی۔
وں نے برہمنوں سے کہہ دیا کہ وہ بوچڑ خانہ بند کر دیں گے اور چماروں سے کہہ دیا کہ اُنھیں چمڑا سستا
زیادہ مقدار میں مہیا کیا جائے گا۔ کرائے داروں سے کہہ دیا کہ اُن کے کرائے کم کر دیئے جائیں
ے اور مکان کے مالکوں سے کہہ دیا کہ مرمت کے بہانے وہ اپنے کرائے بڑھا سکیں گے۔
تھوڑے دنوں میں جب میونسپل الیکشن کا نتیجہ نکلا تو سب سے زیادہ ووٹ "تمہارا
س میں فائدہ ہے" والی پارٹی کو پڑے اور اس کے ممبر بھی سب سے زیادہ تعداد میں چُنے گئے اتفاق
نے سے گوبند رام کو میونسپل کمیٹی کا صدر چن لیا گیا۔
میونسپل کمیٹی کی پہلی میٹنگ میں جب یہ سوال اٹھا کہ تمہارا کس میں فائدہ ہے؟ والے
گرام پر کس طرح عمل کیا جائے؟ تو بہت دیر تک بحث ہوتی رہی، کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ، کسی کی
کچھ نہ آتا تھا کہ کیسے اس پروگرام پر عمل کیا جائے جس کی ہر شق دوسری شق کے خلاف جاتی ہے
رام نے کہا "میرے خیال میں یہ منشور ہی غلط ہے تمہارا کس میں فائدہ ہے۔ اسے

بدل دینا چاہیئے اور اس کے بجائے اس پر عمل کرنا چاہیئے، اپنا کس میں فائدہ
چاروں طرف سے واہ واہ کا ڈونگرا برس گیا" صدر نے کیا نکتہ پیدا
گوبند رام جی! کیا بات پیدا کی ہے"

جب سے گوبند رام جی کی پارٹی شہر بیم پور کی میونسپل کمیٹی پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے گوبند رام اب اچاریہ گوبند رام کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اپنا محلہ چھوڑ کر سول لائن میں سکونت اختیار کی ہے۔ انھوں نے دوسری شادی کر لی ہے جو نئے فرنیچر کی طرح اپ ٹو ڈیٹ اور خوبصورت ہے مجھے پرانے گھر میں چھوڑتے وقت اچاریہ گوبند رام کو بہت دکھ ہوا مگر ان کی نئی فیشن ایبل بیوی اس پر تیار نہیں ہوئیں کہ ایسی بدہیئت شکل، ٹوٹی پھوٹی کرسی کو اپنے گھر میں جگہ دیں۔

میں اس کے بعد بھی کئی سال تک پرانے گھر میں رہی۔ آخر جب میرا حلیہ بالکل بگڑ گیا اور میں کسی کام کی نہ رہی تو بھیکو نے ایک دن نیلام والے کو بلایا اور اس کے ہاتھ بیچ دیا۔ بیچتے وقت اس کے دل سے آہ نکلی اور اس نے آہستہ سے کہا

"یہ میرے بیٹے کی کرسی تھی"

"تمہارا بیٹا کیا کرتا ہے؟"

"وہ میونسپل کمیٹی کا صدر ہے"

"صدر تو ہے مگر کرتا کیا ہے؟" نیلام والے نے پھر پوچھا

"جانے کیا کرتا ہے"، بھیکو نے جواب دیا "مگر میں سوچتا ہوں، وہ ابھی تک دودھ میں پانی ملا کر بیچتا ہے اور نقلی تمباکو والی بیڑی نمبر ون بیچتا ہے"

"اس کے بعد والی داستان بڑی تلخ ہے"

کرسی ایک وقفے کے بعد بولی "پہلے مجھے ایک ایسے آدمی نے خریدا جو بڑا شریف ایماندار اور غریب آدمی تھا لیکن مجھ پر بیٹھتے ہی وہ لاکھوں کی دولت کمانے اور بڑے بڑے کے خواب دیکھنے لگا جب وہ اپنی حرکتوں کے بعد جیل چلا گیا تو مجھے ایک ایسے آدمی نے خرید

بے حد زن مرید تھا لیکن اس نے میرے چوکھٹے پر بیٹھتے ہی اپنی بیوی کو گالیاں سُنانا شروع کر دیں اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ جب اس کی بیوی نے دیکھا کہ جب وہ اس کرسی پر بیٹھتا ہے تبھی ایسی حرکت کرتا ہے تو اس نے اٹھا کر مجھے گھر سے باہر پٹخ دیا۔

وہاں سے ایک گونگے فقیر نے مجھے اٹھا لیا۔ بدقسمتی سے جوں ہی وہ مجھ پر بیٹھا، اس کی زبان کھل گئی اور بولنے لگا اور بولتا ہی چلا گیا اور وہ سب کچھ بولتا گیا جو کبھی گوبند رام بولا کرتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کا بہت علاج کیا مگر اس کا بولنا بند نہ ہوا اور وہ بولتے بولتے مر گیا۔ پھر وہاں سے یہ اسماعیل بھائی لونڈے والا مجھے خرید لایا اب جانے میں کس کے پاس جاؤں گی مگر میں کہیں بھی جاؤں، میری سرشت میں گوبند رام کی خصوصیات اس طرح رچ چکی ہیں کہ میں جہاں بھی جاؤں گی اسی مشہور لیڈر کی کرسی رہوں گی۔"

لیڈر کی کرسی اپنی داستان سُنا کے چُپ ہو گئی۔ محفل میں تھوڑی دیر تک سنّاٹا رہا۔

ایسی دو کتابیں مفت حاصل کیجئے

اگر آپ ایسی دو کتابیں بالکل مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو گھٹیا اور بازاری لٹریچر کے خلاف جہاد میں ہمارا ہاتھ بٹائیں بہترین ادب کی اشاعت ہمارا قومی فریضہ ہے۔ اور آپ ادب اکادمی کے ممبر بن اس میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اکادمی ہر مہینے ایسی ایک کتاب شائع کرے گی۔ دس روپے فی کتاب کے حساب سے بارہ کتابوں کی قیمت مبلغ ۱۲۰/- روپے بنتی ہے جب کہ ممبران کو صرف ۱۰۰/- روپے کے عوض بارہ کتابیں بھیجی جائیں گی۔ اور ڈاک خرچہ بھی اکادمی کے ذمہ ہوگا۔ یوں ایسی دو کتابیں آپ کو بالکل **مفت** ملیں گی۔

لہٰذا جلدی کیجئے اور آج ہی "ادب اکادمی پوسٹ بکس نمبر ۲۵۱۰، کراچی - ۱۸" کے پتہ پر مبلغ ۱۰۰/- روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال کر کے اکادمی کی رکنیت حاصل کر لیجئے۔

ادب اکادمی کے معزز ممبران کے ناموں کی فہرست آئندہ کتاب میں شائع کی جائے گی۔ کوشش کیجئے کہ آپ کا نام سرفہرست ہو۔